رجسٹرڈ نمبر ایل ۵۳۴۰

جمادی الاول ۱۳۷۴ھ

جلد ۴۳ عدد ۵

ماہنامہ

ترجمان القرآن

مرتبہ

نعیم صدیقی

جاری کردہ

سید ابوالاعلیٰ مودودی

دفتر رسالہ ترجمان القرآن

۵۔ اے ذیلدار پارک، اچھرہ — لاہور پاکستان

چندہ سالانہ چھ روپے

قیمت فی پرچہ دس آنے

تفہیم القرآن

از مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب

جلد اول (طبع دوم)

سورۃ فاتحہ تا الانعام

قرآن پاک کا عام فہم سلیس اردو ترجمہ و تفسیر مع عربی متن قرآن حکیم کے فطری طرز استدلال اور اسکی جامعیت پر حکیمانہ تبصرہ غیر اسلامی زندگی پر سائینٹفک تنقید۔ مدلل تشریح و تعبیر

دل نشین انداز بیان

اہم مسائل ۔ فلسفہ ۔ قوانین حیات کی مجتہدانہ وضاحت غیر اسلامی نظام ہائے حیات کے مد مقابل نظام اسلامی کا

مکمل اور جامع نقشہ

سابق کتب مقدسہ کے حذف و اضافہ کی نشاندھی' اسلام اور جاہلیت کی تاریخی کشمکش پر بے لاگ تبصرہ' ان خصوصیات کے ساتھ بصیرت افروز مقدمہ ۔ سورتوں کے عنوانات ان کا زمانہ نزول اور پس منظر ربط آیات ———

جغرافیہ قرآن کے متعدد تاریخی نقشہ جات ۔ فہرست موضوعات بہترین کتابت ۔ عمدہ کاغذ و طباعت ۔ خوشنما مضبوط جلد

سائز $\frac{22\times 29}{8}$ ضخامت ہونے سات سو صفحات

ہدیہ !

قسم اول مع بکس ۱۲ ۲۰ علاوہ

قسم دوم ,, ۴ ۱۸ ختم ہے

قسم سوم بغیر بکس ختم ہے

خصوصی جلدیں !

قسم دوم ۱۲/۲، ۲۲/۰۲، مطلا کنارہ -/۲۹ مطلا جلد و کنارہ -/۳۱، ۱۲/۲۴

قسم اول ۱۲/۲۲، مطلا کنارہ -/۳۱ مطلا جلد و کنارہ -/۳۳

جلد دوم (طبع اول)

سورۃ الاعراف تا بنی اسرائیل

تفہیم القرآن جلد دوم کیلئے ملک کے گوشہ گوشہ سے دریافت کیا جا رہا ہے اسکی طباعت میں تاخیر کا باعث کاغذ کی کمیابی کے سوا کچھ نہیں ۔ امپورٹ کردہ کاغذ پر طباعت ہوچکی ہے توقع ہے کہ آخر فروری تک فرمائشوں کی تعمیل شروع ہوسکے گی جس ترتیب سے ہمارے ہاں فرمائشیں درج ہو رہی ہیں ۔ اسی ترتیب سے تعمیل کی جائیگی اگر فرمائش درج نہیں کرائی تو آج ہی اپنی فرمائش تحریر فرماویں ۔

ناظم

مکتبہ تعمیر انسانیت

موچیدروازہ ۔ گجر گلی ۔ لاہور

ترجمان القرآن

لاہور

فہرست مضامین

جلد ۴۳ | جمادی الاولیٰ ۱۳۷۴ھ مطابق فروری ۱۹۵۵ء | عدد ۵

اشارات	نعیم صدیقی	۲
نظام اسلامی اور اطاعت رسول	نعیم صدیقی	۱۸
عقیدہ ختم نبوت کے چند عمرانی پہلو	عبدالحمید	۳۹
اسلام اور ہمارا قانونی نظام	عبدالقادر عودہ شہیدؒ	۵۲
رسائل و مسائل (احکام زکوٰۃ)	مولانا ظفر احمد عثمانی	۶۱
ایک ضروری استدراک	ابوالاعلیٰ مودودی	۷۲

سید ابوالخیر مودودی پرنٹر پبلشر نے پاکستان پرنٹنگ ورکس میں چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن اچھرہ لاہور سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

ہمارا دستوری مستقبل کیا ہے؟ کیسی سیاسی تقدیر ہمارے پلّے پڑنے والی ہے؟ ہم کیا ہیں، ہمیں کیا ہونا چاہیے؟ ہم کدھر سے آئے ہیں، ہمیں کدھر جانا ہے؟ ہماری منزل کہاں ہے اور ہمارا راستہ کدھر سے جاتا ہے؟

دنیا کے نقشے پر کسی ریاست کے ابھرنے سے پہلے اور کسی نئی ہیئتِ اجتماعی کے ظہور سے قبل اس سوال کا جواب وہ عوامل طے کر چکتے ہیں جو ایک مملکت اور ایک معاشرے کو تشکیل دیتے ہیں۔ کچھ خیالات ہوتے ہیں جو دوسرے خیالات کو شکست دے کر آگے آ چکتے ہیں۔ کوئی نظریہ ہوتا ہے جو دوسرے نظریات کو توڑتا پھوڑتا، ان کے سازگار جوہر کو اپنے اندر جذب کرتا اور ان کے ناسازگار عناصر کو پاؤں میں روندتا واقعات و حوادث کی زمام ہاتھ میں لے چکتا ہے۔ ایک اجتماعی ذہن ہوتا ہے جو تاریخ کے گوناگوں مراحل کی بھٹیوں میں ڈھلتا ڈھلاتا اور تحریکیت کے کسی خاص طرح کے سانچوں میں کوئی متعین شکل اختیار کرتا فرد فرد پر اپنا پرتو ڈال چکتا ہے۔ ایک نصب العین بے شمار اجتماعی تقاضوں اور ضرورتوں، فلاح و بہبود کے تصورات، معاشرے کے بے شمار تفصیلی مقاصد کو اپنے اندر سمیٹتا نگاہوں کو اپنے اوپر مرتکز کر چکتا ہے۔ ایک خاص اخلاقی تصور مؤثر قدروں اور روایات کے سرچشموں سے سیراب ہو ہو کر پروان چڑھ چکتا ہے۔ ایک ذوقِ جمالیات معتقدات، فطری ماحول اور تاریخی ارتقاء کے ملے جلے اثرات سے اپنے معیارات طے کر چکتا ہے۔ اس سارے سرمایۂ تعمیر کو ساتھ لے کر جب کوئی کاروانِ حیات آزادی و استقلال کے مرحلے میں داخل ہوتا ہے تو کسی تامل و توقف کے بغیر تعمیرِ نو شروع ہو جاتی ہے۔ نقشۂ تعمیر موجود ہوتا ہے، مسالہ تیار ہوتا ہے، انجینئر اور معمار پوری صلاحیتوں کے ساتھ آگے آ جاتے ہیں اور معاشرہ کے تمام افراد مزدور بن کر اپنا تعاون پیش کر دیتے ہیں۔

لیکن تاریخ انسانی میں ایک ایسی انوکھی ریاست اور ایک ایسے نرالے معاشرے کی واحد مثال پیش کرنے کا شرف پاکستان کو حاصل ہوا ہے جس کے ساڑھے سات برس کوئی تعمیری قدم اٹھائے بغیر گذر گئے۔ بلکہ اتنی لمبی مدت جس میں تاریخ دوسری سرزمینوں میں نہ جانے کتنی پلٹیاں کھا چکی ہے اور دوسرے معاشروں میں حدوث و تغیر نے کیا کیا گل کھلا دئے ہیں۔ یہاں ابھی تک یہ

اور ایسی ایسی زبانوں سے بولتا ہوا ملے گا کہ آپ حیرت میں ڈوبے رہ جائیں گے۔ ہاں! اجتماعی ذہن اسی طرح ہر ہر زبان سے بولا کرتا ہے۔

درحقیقت ہمارے لٹریچر پر قرآن اور حدیث اپنا سایہ پھیلائے ہوئے ہیں۔ یہ ہماری لٹریری سرگرمیوں کا منبع ہیں۔ قرآن جس کے ایک ایک لفظ کے من جانب اللہ اور برحق اور نور ھدایت ہونے پر ہمارا ایمان ہے، قرآن جسے ہمارے حافظے سینے میں جذب کرتے ہیں، قرآن جسے خواندہ اور ان پڑھ سارے ہی طبقے پڑھتے ہیں، قرآن جسے نمازوں میں دوہرایا جاتا رہتا ہے، قرآن جس پر درس ہوتے ہیں، قرآن جس سے ہماری مجالس کی کارروائیوں کا افتتاح ہوتا ہے، قرآن جس کے مقابلے پر آج تک کوئی دوسری کتاب ہمارے ہاں شائع نہیں ہوتی، وہ قرآن جو ہمارے عالم افکار پر آفتاب بن کے چمکتا ہے۔ اور حدیث جسے ہم قرآن کی مستند شرح مانتے ہیں، حدیث جس میں رسولِ خدا کی نمونہ کی زندگی کا ریکارڈ ہے، حدیث جس کے ریکارڈ کرنے، جس کے نکھارنے، جس کو بعد کی نسلوں تک منتقل کرنے کے لیے انتہا درجہ کی محنتیں اور دماغ سوزیاں کی گئی ہیں، حدیث جو ہمارے دینی نصاب کا اہم جزو ہے، حدیث جس سے قانونِ شرعی کی مستند تفاصیل ملتی ہیں، حدیث جس سے روزمرہ زندگی میں رہنمائی لی جاتی ہے۔ وہ حدیث جو ہمارے علمی و ادبی چمن زاروں پر ہمیشہ ابرِ بہار بن کے برسی ہے۔ قرآن و حدیث وہ فکری طاقت ہیں جس نے ہمارے سوا ہزار سالہ لٹریچر کو مستقل اسلامی مزاج دیا ہے۔

اجتماعی ذہن کی یہ کارفرما طاقت جس کا آئینہ دار ہمارا وسیع لٹریچر ہے کس طرح اتنا بے وزن قرار دیا جا سکتا ہے کہ ایک قوم کے سیاسی مستقبل کا فیصلہ اس کے علی الرغم کسی دوسری شکل میں کر دیا جائے۔ نہ اس لٹریچر کو کتب خانہ بغداد کی طرح آگ کے شعلوں اور دجلہ کی لہروں کے حوالے کیا جا سکتا ہے اور نہ کسی چھومنتر سے اس کے مزاج کو بدلا جا سکتا ہے، اور نہ اسے نظرانداز کر کے ایک انچ بھی آگے بڑھنا ممکن ہے۔

اجتماعی ذہن اگر شعور و فکر کا مظہر ہوتا ہے تو اسی کے ساتھ ایک دوسری چیز اجتماعی ضمیر پائی جاتی ہے جو وجدانی رجحانات کی ترجمانی کرتی ہے۔ جس قوم کا اجتماعی ضمیر مر جاتا ہے اس کے ساتھ جو کچھ بھی آپ کرنا چاہیں کر سکتے ہیں اور جدھر بھی اسے لے جانا چاہیں لے جا سکتے ہیں۔ وہ نت نئے سانچوں میں پڑ کر اپنی شکل بدل سکتی ہے اور نت نئی سمت کو

قوموں کی دستوری ہیئت کے بنانے میں بڑا حصہ ان کے اساسی معتقدات کا ہوتا ہے۔ خدا اور کائنات اور انسان اور زندگی کی حقیقت کے بارے میں جو تصورات راسخ ہو کر عقیدے بن جاتے ہیں۔ اجتماعی زندگی ان سے بے نیاز ہو کر کوئی شکل اختیار نہیں کر سکتی۔ ہر قوم کا ایک نہ ایک فلسفہ ہوتا ہے جو معاشرے میں رچ بس جاتا ہے۔ فلسفے اور نظریے اور عقیدے کے بغیر کبھی کوئی اجتماعی ہیئت موجود نہیں پائی گئی۔ اب کیا دنیا کی ہم ہی وہ انوکھی قوم ہیں جس کے فکر و عمل کی کھیتی میں ایمان و اعتقاد کا سرے سے کوئی تخم تھا ہی نہیں، اور اگر کبھی تھا بھی تو وہ گل سڑ چکا ہے اور اب کوئی چیز ایسی باقی نہیں جو اندر سے زور کر کے فطری طور پر اپنی کونپلیں نکالے۔ بس جو کچھ چاہو باہر سے لا کر گاڑ دو۔ ہمارے پاس کوئی تصورِ حقیقت نہیں ہے، ہم کوئی خیالات نہیں رکھتے، کسی طرح کی متاعِ افکار ہمارے پاس نہیں ہے، کسی نوعیت کے ملی شعور سے ہم بہرہ اندوز نہیں ہیں، ہمارا کوئی زاویۂ نگاہ نہیں، کوئی طرزِ فکر نہیں۔ ہم یونہی جڑوں کے بغیر پیدا ہو گئے تنے کے بغیر بڑھتے چلے گئے، رگوں میں غذا جذب کئے بغیر ہم برگ و بار لاتے رہے۔ اعتقاد اور فکر کے بغیر لکڑی اور پتھر اور گدھے اور خچر کا تصور تو کیا جا سکتا ہے، آدمی اور آدمی کے کسی معاشرے کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔

ہم نہ صرف حقیقت کا ایک خاص امتیازی اعتقاد رکھتے ہیں بلکہ اسی اعتقاد نے ہمیں ایک نئی ملت کی حیثیت سے تشکیل دی ہے، ہمیں پروان چڑھایا ہے اور ہمیں تاریخی صدیوں تک اپنے مستقل وجود کے ساتھ زندہ رکھا ہے ــــــ اور سخت ناسازگار حالات میں زندہ رکھا ہے۔ اس اعتقاد سے ہمارا نقطۂ نظر اور ہمارا طرزِ فکر بنتا ہے، اس سے افکار کا ایک مستقل سرچشمہ ہمارے اندر پھوٹ کے بہہ رہا ہے۔ اس سے ہمارے مخصوص خیالات کی کلیاں نکل نکل کر کھلتی ہیں۔ یہ ہماری زندگی کا وہ امرِ بیج ہے جس سے امنگیں اور آرزوئیں اور ارادے اور عملی منصوبے پیدا ہوتے ہیں۔ یہ اعتقاد مضبوط رہے تو ہم مضبوط رہتے ہیں۔ یہ کمزور پڑ جائے تو ہم بھی کمزور پڑ جاتے ہیں۔ یہ دب جائے تو ہم بھی دب جاتے ہیں، یہ ٹھنڈا ہونے لگے تو ہم بھی ٹھنڈے ہو جاتے ہیں۔ یہ مرجھا جائے تو ہم بھی مرجھا جاتے ہیں۔ یہ نئی کروٹ لے تو ہم بھی نئی کروٹ لینے لگتے ہیں، اور خدانخواستہ یہ اگر مر جائے تو ہم بھی موت کا شکار ہو جائیں گے۔ یہی ہمارا مرکزی شرارِ حیات (SPARK OF LIFE) ہے۔

ہمارا اساسی اعتقاد زندگی کے متعلق یہ ہے کہ یہ کائنات ایک قوتِ برتر کی پیدا کردہ اور اسی کی منظم اور آئینی سلطنت ہے اس سلطنت میں تمام موجودات کی طرح ہمارے لیے اگر کوئی جگہ ہے تو اس قوتِ برتر کی بندگی و اطاعت کی جگہ ہے۔ ہم

خود وہ قوتِ برتر نہیں ہیں جو اس نگری کا راج چلا رہی ہے۔ نہ ہم اس کے شریکِ کار اور حصہ دار ہیں۔ اس لیے ہمیں اپنے لئے ایک ہی مقام نظر آتا ہے جو اس کی رعیت بن کر رہنے کا مقام ہے۔ ہمارا اساسی اعتقاد جہاں وہ ہے، وہاں یہ بھی ہے کہ وہ قوتِ برتر ہمارے بھلے برے سے بے تعلق اور بے توجہ نہیں ہے بلکہ اُس نے زندگی بسر کرنے کے لیے آقا اور بادشاہ اور مالک الملک (SOVERIGN) ہونے کی حیثیت سے ہمیں ایک ضابطہ، ایک ہدایت نامہ اور کام کرنے کا ایک نقشہ دیا ہے۔ اس ضابطے اور ہدایت نامے اور نقشے پر کام کرنے کے لیے اس نے عملی نمونہ پیش کر دینے کے لیے ہمارے اندر سے بہترین انسان کھڑے کئے ہیں۔ پھر ہمارا اساسی اعتقاد یہ ہے کہ اُس قوتِ برتر جسے ہم اللہ اور خدا کہتے ہیں — کی دی ہوئی ہدایت اور اس کے مامور انبیاء کے عملی نمونے سے ہٹ کر زندگی کو جو بھی شکل دی جائے وہ ہمارے فطری موقف سے متصادم، امرِ حق کے بالکل خلاف اور نتائج و اثرات کے لحاظ سے مہلک ہے۔ پھر ہمارا اساسی اعتقاد یہ ہے کہ حق اور باطل، خیر اور شر، صلاح اور فساد، نیکی اور بدی کی تقسیم جس طرح اللہ تعالیٰ اور انبیاء نے کر دی ہے اس کے خلاف کوئی اور تقسیم قابلِ قبول نہیں ہے۔ پھر ہمارا اساسی اعتقاد یہ ہے کہ ہم اپنی زندگی کی سرگرمیوں میں غیر مسئول اور غیر جوابدہ نہیں ہیں بلکہ ہمیں اپنے کارنامۂ زندگی کا پورا پورا حساب پائی پائی کر کے اُسی آقا اور مالک الملک کے سامنے پیش کرنا ہے کہ کہاں تک ہم وفادار رعیت بن کر رہے اور کہاں تک ہم نے انحراف اور بغاوت کا راستہ اختیار کیا اور پھر وفاداری پر امن و مسرت کی دوامی زندگی کی جزا اور بغاوت پر دکھ اور عذاب کی دوامی زندگی کی سزا ملنے والی ہے۔

یہ ہے اساسی اعتقاد کا وہ بیج جس سے ہمارے سارے عقیدے، نظریے، افکار، خیالات اور تصورات رونما ہوتے ہیں اور جو ہمارے زندگی کے ہر شعبے کے لیے ہماری ضرورت کے اصول مہیا کرتا ہے۔ اس اعتقاد کے ہوتے ہوئے ہم کوئی ایسا ریاستی ڈھانچہ نہیں سوچ سکتے جو خدا کی حاکمیت کے تصور کو بالائے طاق رکھ کر تجویز کیا جائے ہم کوئی ایسا دستور نہیں بنا سکتے جس میں ہم اپنے آپ کو اسی بندگی کی پوزیشن پر نہ رکھیں جو کچھ کہ خدا کی اس سلطنت میں از روئے واقعہ اور از روئے فطرت ہے۔ ہم کوئی ایسا سرچشمۂ قانون اور کوئی ایسے قانونی اصولیات کہیں سے لے کر اپنا نہیں سکتے جو کتاب و سنت کے مصدر و ماخذ سے ٹکراتے ہوں۔ ہمارے سیاسی رجحانات کا کوئی بہاؤ اس اعتقاد سے آزاد ہو کر واقع نہیں ہو سکتا۔

اس اعتقاد کے اثر سے آزاد ہو کر ہماری سیاسی تعمیر اور ہمارے دستوری مستقبل کی تشکیل دو ہی صورتوں میں قابلِ تصور ہے

ایک یہ کہ یہ اعتقاد سرے سے نہ کوئی تقاضا رکھتا ہو، نہ ہمارے اندر سے کوئی تحریک کرے۔ نہ ہمارے سوچنے کے انداز پر اپنا پرتو ڈالے۔ یقین جانئیے کہ دنیا کا کوئی کمزور ترین اعتقاد ایسا غیر موثر اور غیر فعال اور غیر محرک نہیں ہو سکتا، کجاکہ معاملہ ایسے اعتقاد کا ہو جس نے بار بار تاریخِ انسانیت میں عظیم درجے کی ملتیں برپا کی ہوں، جس نے تاریخ کے دھارے کا رُخ موڑ دیا ہو، جس نے تمدن و تہذیب کے نئے نئے طوفان کھڑے کر دیئے ہوں اور جس نے نظام ہائے باطل کی جمی ہوئی قوتوں کو اکھیڑ اکھیڑ پھینکا ہو۔ یہ وہ اعتقاد ہے جو ایک طرف دماغوں کو فتح کر لینے والا عقلی استدلال رکھتا ہے اور دوسری طرف دلوں میں بڑے بڑے معرکوں کے لیے تیار کر دینے والے جذبات کو ابھار دیتا ہے۔ یہ حد درجہ کی عقلی قوت سے بھی مالامال ہے اور حد درجہ کا جذباتی زور بھی اپنے اندر رکھتا ہے۔ ایسے عقیدے زمانے کی ہزاروں گردشوں سے گزر کر بھی بے جان اور بے قوت اور بے اثر نہیں ہو سکتے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ ہم پیچھے سے اس اعتقاد کو اپنے اندر سے کھرچ کر آئے ہوتے، اور یہ نہیں تو کم سے کم اب سات ساڑھے سات سال کے دورِ آزادی میں اس فیصلے پر پہنچ جاتے کہ اس اعتقاد کو ساتھ لے کر ہم زندگی کا ایک قدم بھی آگے نہیں اٹھائیں گے۔ یہ کام اگر ہو سکنے والا تھا تو اسے اب تک ہو جانا چاہیے تھا۔ اس اعتقاد کو ہمیں پھانسی پر لٹکا کر اور اس کی لاش فرسودگی کی قبر میں دفن کر کے، اوپر سے فاتحہ، قل اور چالیسویں کی ساری رسوم پوری کرنے کے بعد صاف صاف اعلان کر دینا چاہیے تھا کہ اب ہم مسلمان نہیں رہے ہیں ہم نے صدیوں پرانے اسلام سے فارغ خطی حاصل کر کے نئی راہوں پر چل نکلنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔

لیکن یہ کام نہیں ہو سکا۔ جابر سے جابر بادشاہوں کو اس میں ناکامی ہو چکی ہے۔ گوناگوں ذہنی، مذہبی، کلامی، اخلاقی اور فرقہ وارانہ فتنوں سے یہ بازی سر نہ ہوئی۔ چنگیز و ہلاکو کی تلواریں اس کھیل کو جیت نہ سکیں۔ مغربی امپیریلزم کے لاؤ لشکر اس لڑائی میں فتح نہ پا سکے۔ خود برعظیم ہند میں کانگریس کی متحدہ قومیت اور سیکولر ڈیماکریسی کی طوفانی دعوت ہمارے اعتقاد کے قلعے کو سر نہ کر سکی۔ کسی سرسید اور نیاز فتح پوری اور کسی غلام احمد اور کسی پرویز کی مساعی اس معاملے میں برگ و بار نہ لا سکیں۔ تو لوگو! اب اور کس شبھ گھڑی کا اور کس پہلوان کا اور کس نئے ہتھیار کا انتظار کر رہے ہو کہ جا[illegible] جیتنے کے بعد اس اعتقاد کے مطالبوں اور تقاضوں سے جان چھڑائی جا سکتی ہے۔

اگر مسلمان ایک زندہ قوم ہیں تو ان کا اعتقاد ایک اٹل قوت ہے۔ اس اٹل قوت کو غیر موجود فرض کر کے کوئی دستوری ہیئت اور کوئی سیاسی نقدیر، تجویز یا اختیار نہیں کی جا سکتی۔ تاریخ جو قدم بھی اٹھائے گی اس اعتقاد کی رضامندی سے

اٹھا سکے گی۔ یہ اعتقاد اگر اس کا ساتھ نہیں دے گا تو تاریخ کی ندی کا ایک ایک قطرہ منجمد ہو کر اپنی جگہ پر تھم جائے گا اور کسی دوسری طاقت کی مجال نہیں کہ وہ اس کے بہاؤ کو جاری کر سکے۔ چنانچہ آج سات برس سے یہ بہاؤ اسی لیے رکا ہوا ہے۔ جب اس اعتقاد کی اہمیت تسلیم کی جاتی ہے، از سرِ نو حرکت شروع ہو جاتی ہے اور جب یہ اہمیت نظر انداز کی جاتی ہو تو پھر ڈیڈ لاک پیدا ہو جاتا ہے۔

قوموں اور معاشروں کے مستقبل کو بنانے والا ایک بڑا زوردار عامل ان کی اپنی تاریخ ہوتی ہے۔ کسی کا مستقبل ہوا میں کھڑا نہیں ہو جاتا بلکہ ہمیشہ ماضی کی مضبوط زمین پر کھڑا ہوتا ہے۔ واقعات کا تسلسل ہوتا ہے جو پیچھے سے جس نہج پر چلا آرہا ہوتا ہے اسی کے مطابق آگے کچھ نتائج نکلتے ہیں۔ یہ ممکن نہیں ہوتا کہ انسانی زندگی میں یکایک کوئی ایسا نقشہ ابھر آئے جس کے پیچھے واقعاتی تسلسل سرے سے موجود نہ ہو، ایک دستور ایسا اس کے ذہن سے آنکلے جسے پچھلی ساری تاریخ سے کوئی رابطہ نہ ہو۔ ایک سیاسی ہیئت ایسی نمودار ہو جائے جس کا ماضی سے کوئی جوڑ نہ ہو۔ معاشرہ ایسے نظریے اور نصب العین کو لے کے اٹھ کھڑا ہو جسے پچھلی تاریخ نے کبھی اپنی گود میں لے کر پالا نہ ہو۔

پھر کیا ہماری کوئی تاریخ نہیں؟ کیا ہم یکایک ابھی ابھی منصۂ شہود پر ابھرے ہیں جنہیں ورثے میں کوئی تاریخ نہیں ملی، بلکہ جو کچھ بھی بنانا ہے وہ اب بنانا ہے؟ کیا ہمارا کوئی ماضی نہیں جسے ہم اپنے مستقبل کی بنیاد بنائیں؟ کیا ہمارے پاس ملی تجربات کا کوئی خزانہ نہیں کہ جس کی روشنی میں ہم تعمیرِ نو کا نقشہ بنائیں؟ کیا ہمارا سرمایۂ دوش کچھ نہیں کہ جس کے بل پر اپنے فردا کا آغاز کریں؟

اگر ہماری کوئی تاریخ ہے ــــــ اور یقیناً ڈیڑھ ہزار سال کی عظیم تاریخ ہے ــــــ تو کیا کوئی ترکیب ایسی ہے کہ ہم اس کے نقوش کو وقت کے اوراق پر سے دھو ڈالیں؟ ہم اس کے نشانات کو اجتماعی حافظے سے الگ کر سکیں؟ ہم ماضی اور مستقبل کا رشتہ کاٹ ڈالیں، ہم دوش اور فردا کے جوڑ کو کھول دیں؟ ہم اپنے آنے والے کل کا پیوند اپنے گذرے ہوئے کل اور آج سے جدا کر سکیں ــــــ یہ قطعی طور پر ناممکن ہے؟

ہماری تاریخ ایک ہمزاد کی طرح ہمارے ساتھ ہے، ہماری تاریخ ہمارے فکر و شعور، ہمارے جذبات و احساسات اور ہمارے خلق و کردار پر اپنی چھاپ ڈالے ہوئے ہے، ہماری تاریخ ہمیں چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہے،

ہماری تاریخ ہمارے سینے میں گھر کئے ہوئے ہے، ہماری تاریخ ہمارے دماغوں کی تہوں میں اتری ہوئی ہے، یہ تاریخ ہماری اجتماعی زندگی کا گوشت پوست بن چکی ہے۔ ہم اپنے اس خزانۂ بیش بہا کو جب سے پیدا ہوئے ہیں کندھوں پر لادے چلے آ رہے ہیں۔ اس سرمایۂ حیات کو ہم سینوں سے لگائے ہوئے جادۂ حیات پر گامزن ہیں۔ یہ ہماری فکروں میں کروٹیں لیتی ہے، یہ ہمارے جذبوں میں متحرک ہے، یہ ہماری تقریروں میں بولتی ہے، یہ ہماری تحریروں میں ظہور کرتی ہے۔ یہ ہمارے شعروں میں مسکراتی اور آنسو بہاتی ہے، یہ ہماری کہانیوں میں اپنی رام کہانی کہتی ہے، یہ ہمارے نغموں میں اپنے راگ الاپتی ہے۔ یہ ہمارے ارادوں کی امڈتی ہوئی بوجھل گھٹاؤں میں بجلی بن کے کوندتی ہے اور یہ ہماری تحریکوں کے سیلِ تند و تیز میں لہریں بن بن کے آگے بڑھتی ہے۔

پھر یہ شرمناک تاریخ ہوتی تو یقیناً اس قابل تھی کہ اسے دریا برد کر دیا جائے۔ یہ اگر قدر و قیمت سے خالی ہوتی تو اسی سلوک کی مستحق ہوتی کہ نہایت بے رحمانہ اپریشن سے اس کی جڑوں کو ہم اپنے اجتماعی ذہن سے کھرچ کر الگ کر دیتے لیکن یہ ایک ایسی قوم کی جدوجہدِ حیات کی داستان ہے جس نے انسانیت کو ایک پاکیزہ فکر، ایک ہمہ گیر نظریۂ حق، ایک نظامِ صالح، ایک اجتماعی اخلاق اور ایک روشن تہذیب دی ہے، جس نے علم و فن کو اپنی خدمات سے چار چاند لگا دئیے ہیں، جس نے انسان کو اس کے پورے حقوق دلوائے ہیں، جس نے ترقی کے وہ دروازے کھولے ہیں جن پر قفل پر قفل لگے ہوئے تھے۔ اور ہاں یہ اس عظمت مآب قوم کی کامیابیوں اور ناکامیوں کی کہانی ہے جس نے ظلم و جبر کی بے شمار گھاٹیاں طے کیں مگر اپنی متاعِ فکر کا کوئی حصہ راستے میں ضائع نہیں ہونے دیا، جس نے لمبی اور غلامی، معاشی خستہ حالی اور معاشرتی فساد، ہجرتوں اور جلاوطنیوں کے رنگا رنگ صبر آزما دور دیکھے مگر سنگین سے سنگین حالات اسے اپنی حقیقت سے غافل نہ کر سکے۔ اور ہاں یہ اس لاثانی قوم کے تبسموں اور آنسوؤں کی سرگذشت ہے جس نے انقلابات کی بے شمار گردشوں سے گذرنے کے بعد نہ اپنے مرکزِ اعتقاد کو چھوڑا، نہ اپنے نصب العین سے نگاہ ہٹنے دی۔ ایک زندہ قوم کی ایسی زندہ تاریخ کو دریا برد نہیں کیا جا سکتا۔

اس تاریخ کے حوادث کی تمام کڑیوں کو اوپر سے نیچے تک ہمارا جو مستقل شعور و احساس جوڑ کر ایک کرتا ہے وہ یہ ہے کہ ہم مسلم ہیں۔ یہ شعور و احساس اگر نابود ہو سکتا تو اس تاریخ کا ربط ختم ہو جاتا، اس کے واقعات کا شیرازہ کھل جاتا اور ورق ورق الگ الگ بکھر گیا ہوتا، اس کا تسلسل ختم ہو جاتا اور کل اور آج کو جوڑنے والی کوئی طاقت

باقی نہ رہتی۔ پھر یہ شعور و احساس ایسا گہرا ہے اور موثر ہے کہ نظام کے انتہائی فاسد ہو جانے پر اور ماحول کے حد سے زیادہ بگڑ جانے پر اور معاشرے کی فضا کے شدید طور سے مکدر ہو جانے پر بھی ہمیشہ زندہ رہا ہے، یہ اُس حالت میں بھی زندہ رہا ہے جب کہ ناسازگار ماحول نے افراد کی عملی زندگیوں کو بالکل چوپٹ کر ڈالا ہے، بلکہ حد یہ کہ آج ہمارے بعض بگڑے ہوئے افراد جو اسلام کے راستے میں روڑا بنے پڑے ہیں، وہ اپنی ساری حرکات کے بعد بھی یہ جرأت نہیں کر سکتے کہ مسلم ہونے کا انکار کر کے اور اسلام سے صاف علیحدگی اختیار کر کے سامنے آئیں۔ ہماری پوری تاریخ میں ایسا نہیں ہوا۔ پھر یہ شعور و احساس محض زندہ ہی نہیں رہا بلکہ یہ نظام اور ماحول اور معاشرے کے بگاڑ کے خلاف ہمیشہ ٹکر لیتا رہا ہے۔ اس نے بار بار جد و جہد کے لیے ذہین اور شریف اور بہادر لوگوں کو ہمارے اندر سے اٹھا کھڑا کیا ہے۔ اس نے مسلمانوں کو کسی غیر اسلامی اصول اور ہیئت کے زیر سایہ چین سے نہیں بیٹھنے دیا اور کسی غیر اسلامی نظریے سے مصالحت نہیں کرنے دی۔ اس نے اضداد میں سمجھوتہ نہیں ہونے دیا۔ اس نے ہمارے اندر کے اونچے لوگوں سے قابلِ یادگار قربانیاں دلوائی ہیں اور یہ قربانیاں بعد کی نسلوں کے لیے راستہ دکھانے والی مشعلوں کی حیثیت اختیار کر گئی ہیں۔ ہمارا یہ شعور و احساس جو ہماری تاریخ میں وہاں سے یہاں تک چھایا ہوا ہے، پچھلی ساری قربانیوں کی طاقت اپنے اندر سمیٹ کر آج ہمارے اجتماعی ذہن میں موجزن ہے۔ یہ تاریخ جو صرف منفعلانہ تاریخ نہیں بلکہ ہماری جد و جہد کی تاریخ ہے، جو ٹھنڈے اور جامد مزاج کی نہیں بلکہ گرم اور متحرک مزاج کی مظہر ہے" وہ ناسازگار حالات سے دب جانے والے ارادوں کی نہیں، بلکہ مخالف قوتوں سے ٹکرا جانے والے عزائم کی آئینہ دار ہے کیا یہ ایسی غیر موثر چیز ہو سکتی ہے کہ یہ اپنے جوہرِ زندہ کے مزاج سے برعکس قسم کے کسی دستور اور کسی سیاسی ہیئت کو اپنے سائے میں پنپنے دے؟ کیا یہ تاریخ جس کے سارے کے سارے ابواب احیائے اسلام کی تحریکوں کی رودادوں سے بھرے ہیں، آج ان سارے ابواب پر خطِ نسخ کھینچنے والا کوئی سیاسی نظریہ و نظام اختیار کیا جا سکتا ہے

دستور وہی چلے گا، نظام وہی جم سکے گا جو اس تاریخ میں کارفرما رہنے والے ہمارے ملی شعور و احساس سے مطابقت رکھتا ہو۔ ورنہ گول خانے میں چوکھونٹی چیز کو فٹ کرنے کی کوشش، قوم کو کبھی چین سے نہ بیٹھنے دے گی

ایک ملت یا معاشرے کے خارجی واقعات و حالات ہی کا نام تاریخ نہیں ہوتا بلکہ تاریخ بنانے والی

بڑی طاقت خود خیالات کی طاقت ہوتی ہے۔ ملت کا اجتماعی ذہن جہاں حالات و واقعات سے متاثر ہوتا ہے وہاں خیالات کی طاقت کے ذریعے خود ان کو متاثر بھی کرتا ہے۔ سیاسی، معاشی اور معاشرتی حوادث اور اجتماعی ذہن کے فکر و خیال کی لہریں آپس میں جو عمل و ردِ عمل جاری رکھتی ہیں۔ ان کے مشترک عمل سے تاریخ تشکیل پذیر ہوتی ہے تاریخ اجتماعی ذہن کے زیر اثر بنتی ہے اور اجتماعی ذہن تاریخ کے زیر اثر ارتقا کرتا ہے۔ پس کسی ملت اور معاشرے کا اجتماعی ذہن خود ایک ایسی طاقت ہے جو اس کے مستقبل کو بنانے والے عوامل میں نمایاں حیثیت رکھتا ہے۔ یہ اجتماعی ذہن کا سمندر ہوتا ہے جو اپنے اندر سے خیالات کی رویں اور لہریں اٹھاتا ہے، حوادث اپنے پتھر اس کے اندر پھینکتے ہیں تو بھنور بنتے ہیں اور ان کے گرد لہروں کے دائرے بن بن کر پھیلتے جاتے ہیں، انقلاب کے جھکڑ چلتے ہیں تو وہ پانی کو اپنی سمت پر دھکیلتے ہوئے جنبشیں پیدا کرتے ہیں، پھر دوسرے سرچشموں سے بہہ کر آنے والے افکار وخیالات کے ندی نالے اس میں آ کر گرتے ہیں تو دُور تک ان کے ریلے اپنا اثر ڈالتے جاتے ہیں۔ اجتماعی ذہن کا سمندر ان مختلف حرکت زا طاقتوں کے ذریعے ہر آن بلویا جاتا رہتا ہے اور ہر آن وہ اپنی سطح کو بحال اور اپنی اندرونی لہروں اور رووں کو غالب رکھنے میں زور کرتا رہتا ہے۔ اس لحاظ سے ہمارا اجتماعی ذہن ایک ایسا سمندر ثابت ہوا ہے جس کی داخلی رویں اور لہریں بیرونی تحریکوں پر ہمیشہ چھائی رہی ہیں۔ مثلاً روم و ایران کی تہذیبی برتری نے ہمارے اوپر اثر ڈالنا چاہا لیکن ایک پیش نہ گئی۔ پھر یونان کا فلسفہ آگے بڑھا لیکن بہت جلد اس کا زور ٹوٹ گیا۔ پھر عجمی تصوف نے حملہ کیا لیکن ہمارے اجتماعی ذہن نے اس کے مقابلے میں بھی اپنی امتیازی ساخت کو بحال کر لیا۔ ہندو کلچر نے اس حصار کو توڑنے کی کوشش کی، لیکن فصیل میں چند دراڑیں ڈالنے سے زیادہ کچھ نہ کیا جا سکا۔ آخر میں جدید مغربی مادہ پرستانہ فکر و تمدن نے ایک بے پناہ یورش ہمارے اوپر کی ہے لیکن ہر ہر مورچے میں فاتحانہ اور غالبانہ طاقت کے ساتھ زور آزمائی کرنے کے باوجود یہ طوفانی طاقت بھی ہمارے اجتماعی ذہن کی ساخت کو توڑ نہیں سکی۔

فکر و خیال کی دنیا میں جو معرکے ہماری تاریخ میں لڑے گئے ہیں اور پھر توڑ پھوڑ کے ہنگاموں کے بعد ہمارا اجتماعی ذہن جس طرح اپنی جگہ پر بار بار قائم ہو جاتا ہے اس کا ریکارڈ ہمارا سوا ہزار سالہ ملی لٹریچر ہے۔ یہ لٹریچر ہماری بنیادی فکر کا پورا پورا جوہر شروع سے آخر تک اپنے اندر لیے چلا آ رہا ہے۔ اس لٹریچر سے خارج کے ہر فکری حملے اور اندر کے ہر نظریاتی فتنے کا سراغ مل سکتا ہے۔ اس لٹریچر سے دفاعی جہاد کی ساری کوششوں کا اندازہ لگایا

جاسکتا ہے۔ یہ لٹریچر بتاتا ہے کہ ہماری دلیل کی قوت کتنی مضبوط اور ہمارے ایمان کی طاقت کتنی اٹل ہے۔ اس لٹریچر میں ہماری اخلاقی قدریں محفوظ ہیں۔ یہ ہماری اعلیٰ اور تابندہ روایات کو آغوش میں لیے ہوئے ہے۔ یہ ہمارے دیرینہ اور گہرے جذبوں کا آئینہ دار ہے اور یہ ہمیں وہ چیز دیتا ہے جو ہماری ساری تاریخ کے واقعاتی و فکری تصادموں کے اندر چٹان کی طرح جمی کھڑی رہتی ہے اور طوفانی تاریکیوں میں جگمگاتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ ہمارا وہ ذہنی سرمایہ ہے جو مستقل قدر و قیمت رکھتا ہے۔ تفسیر کے دفتر دیکھیے یا احادیث کے ذخیروں کا جائزہ لیجیے، فلسفہ و تصوف کی کتابیں سامنے رکھیے یا طب اور کیمیا کی تاریخ اور عمرانیات پر تصانیف ملاحظہ فرمائیے یا اخلاق، سیاست، معیشت اور مالیات پر، ٹھوس معلوماتی نتائجِ کاوش پر نگاہ ڈالیے یا ہلکے پھلکے ادب شعر پر، پورا لٹریچر مجموعی حیثیت میں بول بول کر کہہ رہا ہے کہ میں ایک مسلم ملّت کا سرمایۂ فکر و کاوش ہوں۔ پھر بالکل قرونِ اولیٰ کے علمی کارناموں سے گذریئے، یا قرونِ متوسط کے، یا بالکل آخری دور کے، یہ سب کے سب ہمارا ہاتھ پکڑ کر ہمیں اسلام کی بارگاہ تک لے جاتے ہیں اور ہمیں ہمارے اصل مرکز ذہن سے ہٹنے نہیں دیتے۔ اس آخری دور میں خود اس برعظیم کے مسلم لٹریچر کے عجائب خانے میں داخل ہو کر دیکھیے تو یہاں آپ کو شاہ ولی اللہ دہلوی، شاہ عبدالحق محدّث دہلوی، شاہ اسمٰعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ، مولانا اشرف علی تھانوی، مولانا محمود الحسن سید سلیمان ندوی، مولانا عبدالسلام ندوی، مولانا آزاد، مولانا ظفر علی خاں۔ مولانا محمد علی جوہر۔ علامہ شبلی نعمانی، اکبر شاہ خاں نجیب آبادی، ڈپٹی نذیر احمد دہلوی، مولانا حالی علامہ اقبال۔ ڈاکٹر حمید اللہ، مولانا عبدالماجد دریابادی۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی، مولانا امین احسن اصلاحی اور دوسرے بے شمار اہل علم کی کتابوں کے انبار کے انبار ملیں گے، جن سے کوئی بھی مطالعہ کرنے والا بچ بچا کے نہیں نکل سکتا، بلکہ وہ لوگ بھی جو بظاہر کچھ انوکھی باتیں کرنے والے ہیں یا کسی پہلو سے بہک گئے ہیں ان کے قلمی کام میں بھی اسلام کے کچھ نہ کچھ پہلو ضرور نمایاں ہیں۔ بہ حیثیت مجموعی اس سارے علمی سرمائے کو دیکھیے تو یہ نئی نسلوں کو اسلام سے ہٹانے والا نہیں اسلام کی طرف کھینچ لے جانے والا اور اسلامی حس کو بیدار کرنے اور اسلامی شعور کو زندہ کرنے والا ہے۔ صحافت اور خطابت کو بھی اگر اجتماعی ذہن کے اظہار کا ذریعہ ہونے کی حیثیت سے لٹریچر کے ساتھ لے لیا جائے تو ان میدانوں میں بھی اسلام بولتا ہوا ملے گا۔

اور ایسی ایسی زبانوں سے بولتا ہوا ملے گا کہ آپ حیرت میں ڈوبے رہ جائیں گے۔ ہاں! اجتماعی ذہن اسی طرح ہر ہر زبان سے بولا کرتا ہے۔

درحقیقت ہمارے لٹریچر پر قرآن اور حدیث اپنا سایہ پھیلائے ہوئے ہیں۔ یہ ہماری لٹریری سرگرمیوں کا منبع ہیں۔ قرآن جس کے ایک ایک لفظ کے من جانب اللہ اور برحق اور نور ھدایت ہونے پر ہمارا ایمان ہے، قرآن جسے ہمارے حافظے سینے میں جذب کرتے ہیں، قرآن جسے خواندہ اور ان پڑھ سارے ہی طبقے پڑھتے ہیں، قرآن جسے نمازوں میں دوہرایا جاتا رہتا ہے، قرآن جس پر درس ہوتے ہیں، قرآن جس سے ہماری مجالس کی کارروائیوں کا افتتاح ہوتا ہے، قرآن جس کے مقابلے پر آج تک کوئی دوسری کتاب ہمارے ہاں شائع نہیں ہوتی، وہ قرآن جو ہمارے عالم افکار پر آفتاب بن کے چمکتا ہے۔ اور حدیث جسے ہم قرآن کی مستند شرح مانتے ہیں، حدیث جس میں رسولِ خدا کی نمونہ کی زندگی کا ریکارڈ ہے، حدیث جس کے ریکارڈ کرنے، جس کے نتھارنے، جس کو بعد کی نسلوں تک منتقل کرنے کے لیے انتہا درجہ کی محنتیں اور دماغ سوزیاں کی گئی ہیں، حدیث جو ہمارے دینی نصاب کا اہم جزء ہے، حدیث جس سے قانونِ شرعی کی مستند تفاصیل ملتی ہیں، حدیث جس سے روزمرہ زندگی میں رہنمائی لی جاتی ہے۔ وہ حدیث جو ہمارے علمی و ادبی چمن زاروں پر ہمیشہ ابرِ بہار بن کے برسی ہے۔ قرآن و حدیث وہ فکری طاقت ہیں جس نے ہمارے سوا ہزار سالہ لٹریچر کو مستقل اسلامی مزاج دیا ہے۔

اجتماعی ذہن کی یہ کارفرما طاقت جس کا آئینہ دار ہمارا وسیع لٹریچر ہے کس طرح اتنا بے وزن قرار دیا جاسکتا ہے کہ ایک قوم کے سیاسی مستقبل کا فیصلہ اس کے علی الرغم کسی دوسری شکل میں کردیا جائے۔ نہ اس لٹریچر کو کتب خانہ بغداد کی طرح آگ کے شعلوں اور دجلہ کی لہروں کے حوالے کیا جاسکتا ہے اور نہ کسی چھو منتر سے اس کے مزاج کو بدلا جاسکتا ہے، اور نہ اسے نظرانداز کرکے ایک انچ بھی آگے بڑھنا ممکن ہے۔

اجتماعی ذہن اگر شعور و فکر کا مظہر ہوتا ہے تو اس کے ساتھ ایک دوسری چیز اجتماعی ضمیر پائی جاتی ہے جو وجدانی رجحانات کی ترجمانی کرتی ہے۔ جس قوم کا اجتماعی ضمیر مرجاتا ہے اس کے ساتھ جو کچھ بھی آپ کرنا چاہیں کرسکتے ہیں اور جدھر بھی اسے لے جانا چاہیں لے جاسکتے ہیں۔ وہ نت نئے سانچوں میں پڑکر اپنی شکل بدل سکتی ہے اور نت نئی سمت کو

رُخ کر کے سفر کا آغاز کر سکتی ہے۔ وہ خیر و شر کے معیارات اور قدروں کے پیمانوں کو بار بار توڑ کر نئی صورت دے سکتی ہے اب اگر ہمارا کوئی اجتماعی ضمیر سرے سے نہ ہوتا، یا ہوتا تو مر گیا ہوتا، یا زندہ رہتا مگر مسخ ہو چکا ہوتا تو آسانی ہم ہر بے لگام موڑ مڑ سکتے تھے۔ مگر یہاں ان میں سے کوئی بات بھی نہیں ہے۔ مسلمانوں میں یہ ایک مستقل حس موجود ہے کہ حالات کی جو تبدیلی اسلام کے حق میں واقع ہوتی ہے وہ اس پر اطمینان کی کیفیت محسوس کرتے ہیں اور زندگی جو موڑ بھی اسلام کے خلاف مڑتی ہے اس پر وہ مضطرب ہونے لگتے ہیں اور ان کا یہ اضطراب مسلسل زندہ رہتا ہے۔ یہ ان کا اجتماعی ضمیر ہے جو انہیں کسی ایسی حالت پر راضی نہیں ہونے دیتا جو غیر اسلامی فکر و عمل کی مظہر ہو۔ یہ ان کا اجتماعی ضمیر ہے جو زندگی کو مذہب و سیاست کے دو خانوں میں بانٹ کر دو متضاد نظریوں کو یکجا کرنے پر کبھی امن چین نہیں پانے دیتا۔ یہ ان کا اجتماعی ضمیر ہے جس کے زیر اثر وہ ہر اس تضاد اور تصادم پر نالاں ہوتے ہیں جو ان کی زندگیوں پر اثر انداز ہوتا ہے۔ یہ اُن کا اجتماعی ضمیر ہے جو غیر اسلامی نظاموں کی چمک دمک سے ان کو مرعوب نہیں ہونے دیتا۔ یہ ان کا اجتماعی ضمیر ہے جو انہیں ہر باطل کے خلاف ذوقِ تغیر سے سرشار کر کر کے اٹھا کھڑا کرتا ہے۔

اب یا تو کوئی ایسا کامیاب نسخہ کسی لقراطِ دوراں کے ہاتھ آ جائے جس کے استعمال سے یہ ضمیر قطعی طور پر مر جائے یا اسے مسخ کر کے کوئی اور شکل دی جا سکے، ورنہ جب تک یہ اپنا کام کر رہا ہے کسی بھی مسلمان قوم پر اسلام کے اصولوں سے ہٹا ہوا کوئی دستوری نقشہ ٹھونسا نہیں جا سکتا۔

آزادی حاصل کرنے کے بعد کسی بھی قوم میں نظام وہ چلتا ہے جو اس محرکِ آزادی کے مطابق ہو جس کی تحریک سے اس نے سر دھڑ کی بازی لگا کر غیروں کی غلامی سے نجات پائی ہو۔ چنانچہ آزادی کی جدوجہد کے دوران میں ہی زندگی کا وہ نقشہ، معاشرے کی وہ تقدیر اور قوم کا سیاسی نظم متعین ہو جاتا ہے جس پر آزادی کی نئی تعمیر شروع ہونے والی ہوتی ہے۔ اب غور فرمائیے کہ کیا مسلمانوں کو آزادی یونہی بلا کسی جدوجہد کے چھپر پھاڑ کر مل گئی ہے اور اب ان کو معلوم نہیں کہ اس کا مصرف کیا ہے؟ اگر انہوں نے ہر ہر ملک میں آزادی جدوجہد سے حاصل کی ہے تو کیا یہ جدوجہد بغیر کسی محرک کے واقع ہو گئی، یہ گاڑی کسی اسٹیم کے بغیر قرنوں کی مسافت طے کر گئی! لیکن اگر کوئی محرک تھا تو اس محرک سے ہٹ کر مستقبل کا کوئی نقشہ نہیں سوچ سکتے! سوال صرف یہ ہے کہ وہ محرک کیا تھا؟

وہ لوگ جو مسلمان قوموں کو مغربی نظامِ حیات کی طرف لے جانا چاہتے ہیں وہ گویا اس مفروضے پر چل رہے ہیں کہ مسلمان قومیں اس جذبے سے آزادی کی جدوجہد کر رہی تھیں کہ وہ مغربی نظامِ حیات کی طرف مارچ کرنا چاہتی تھیں اور سامراج اس میں حائل تھا؟ کیا یہ مفروضہ اپنے اندر ہزارویں حصے کی حد تک بھی کوئی صداقت رکھتا ہے؟ کوئی اس کا دعویٰ کر سکتا ہے؟ البتہ قابلِ غور ہے ان لوگوں کا نظریہ جو یہ کہتے ہیں کہ غیروں کے معاشی استحصال سے نجات پانے کا شکمی محرک اصل کارفرما قوت تھا۔ ہم تسلیم کرتے ہیں کہ اقوام کی جدوجہدِ آزادی کے محرکات میں یہ چیز بھی شامل ہوتی ہے کہ وہ معاشی ظلم سے نکلنا چاہتی ہیں اور استقلال کی سطح پر آنا چاہتی ہیں تاکہ وہ جس کھیت کو بوئیں اس کی فصل خود کھا سکیں لیکن کسی قوم کی مثال ایسی نہیں پیش کی جا سکتی جو تنہا معاشی محرک کے بل پر آزادی کی جنگ لڑی ہو۔ لازماً دوسرے محرکات شامل ہوتے ہیں اور مختلف محرکات میں سے کوئی ایک پیش پیش طاقت (GOVERNING FORCE) بن کر کام کرتا ہے۔ معاشی استحصال جس درجہ انسان کو کھٹکتا ہے اس سے کئی گنا زیادہ یہ بات اسے مضطرب کرتی ہے کہ وہ جن اعتقادات، جن رجحانات، جن خیالات اور جن اخلاقی قدروں اور جن تاریخی روایات کو اپنا اصل سرمایۂ حیات سمجھتا ہو، کوئی حکومت اجتماعی نظام کو ان کے بالکل مخالف راستے پر چلائے، جن چیزوں کو لوگ محبوب رکھتے ہوں ان کی قدر و قیمت ختم ہو جائے، جن کو وہ نفرت سے دیکھتے ہوں وہ پورے ماحول پر چھا جائیں جن کو وہ حرام سمجھتے ہوں وہ حلال ہو جائیں اور جن کو حلال گردانتے ہوں وہ حرام کر دی جائیں جن امور کو وہ گناہ سمجھتے ہوں وہ لازمۂ حیات بننے لگیں اور جس کو وہ صواب مانتے ہوں وہ جرم بنا دی جائیں۔ اپنی مرضی کے نظام اور ماحول کے بجائے جب برعکس قسم کا نظام اور ماحول کسی معاشرے پر مسلط ہو جاتا ہے تو وہاں ارادے اور امنگیں اور دلچسپیاں ہر طرف سے بھنچ جاتی ہیں، گویا سانس گھٹنے لگتی ہے، خون کا دوران تھمنے لگتا ہے۔ اس حالت کا نتیجہ کرب ہے۔ یہی کرب جدوجہدِ آزادی کی شکل اختیار کرتا ہے۔ ہم جیسا کہ اوپر بیان کر آئے ہیں، ہمارا ایک مخصوص اعتقاد ہے اور زندہ اعتقاد ہے، ہماری ایک تاریخ ہے اور موثر تاریخ ہے، ہمارا ایک اجتماعی ذہن ہے اور فعال ذہن ہمارا ایک ملی ضمیر ہے اور جیتا جاگتا ضمیر ہے۔ غلامی کے ماحول نے جب ان میں سے ہر چیز سے ٹکرانا اور اسے بھینچنا شروع کیا تو اضطراب پیدا ہوا اور وہی اضطراب پھر محرکِ جدوجہد بنا۔ آپ چاہیں جس مسلمان قوم کی تازہ تاریخ کو اٹھا کے دیکھ لیں اس میں آپ کو یہ امرِ واقعہ ضرور ملے گا کہ مسلمان قوموں کی جدوجہد آزادی میں خود اسلام

حرکت و اقدام کر رہا ہے اور دینی طاقتیں ایسی جدوجہد میں پیش پیش ہیں۔ جہاں بھی مغربی قوموں کے تسلط کے خلاف کوئی تحریک اٹھی ہے براہ راست مغربی فکر و تہذیب کے خلاف اٹھی ہے اور اعتقادی و دینی بنیادوں پر اٹھی ہے۔ ہر جگہ احیائے اسلام اور نظام اسلامی کی منزل تک پہنچنے کا جذبہ کام کرتا ملتا ہے۔ تقریروں اور نعروں کو دیکھئے تو یہی شہادت ملتی ہے کہ ان تحریکوں کی منزل ہر جگہ قرآن کے اصولوں پر اپنے ایمان کے مطابق ایک ریاست اور معاشرہ تعمیر کرنا ہے۔

تحریک پاکستان کی نوعیت بھی قطعاً یہی ہے۔ جدوجہد آزادی کے مختلف محرکات پر جو چیز چھائی ہوئی ہے وہ ایک ناسازگار غیر اسلامی نظام سے نکل کر ایک اسلامی نظام تک پہنچنے کا جذبہ ہے۔ اس تحریک کا لٹریچر (جو کچھ وہ ہے) اس کی تقریریں، اس کے ریزولیوشن، اس کے نعرے، اس کی بولی، اس کی اصطلاحات سب کے اندر یہی جذبہ بول رہا ہے۔ یہ مسلمانوں کے ایک جداگانہ قوم ؛ عقیدے سے بننے والی قوم، ایک جداگانہ نظریۂ حیات رکھنے والی قوم اور ایک مستقل تہذیب کی مالک قوم کی تحریک بن کے اٹھی۔ اسی لحاظ سے اس کو چلانے والی تنظیم مسلم لیگ کے نام سے سامنے آئی۔ اسی لحاظ سے زمین کے نقشے پر ابھرنے والی نئی مملکت کا نام پیشتر سے پاکستان رکھا گیا یعنی ایک پاک قوم کا گھر جو پاک اصولوں پر ایک پاک نظام برپا کرنے والی ہے۔

ہمارا یہ محرک آزادی پہلے دن سے انگلی اٹھا کر بتا رہا تھا کہ ہمیں جانا کہاں ہے، پھر سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ آج کچھ لوگوں کو کیوں التباس پیش آگیا ہے کہ وہ سات برس سے پڑے سوچ رہے ہیں کہ ہم کیا کریں! اس محرک آزادی نے اب ایک تاریخی حقیقت کی شکل اختیار کر لی ہے اور اب اس سے آسانی سے پیچھا نہیں چھڑایا جا سکتا اس سے تضاد رکھنے والا مستقبل یہاں کھپنے کا نہیں۔

آخری موثر طاقت جو ہمارے مستقبل کا تعین کر رہی ہے، ہمارا ارادۂ عمومی (PAPULAR WILL) ہے۔ اوپر کی ساری چیزیں مل جل کر اس ارادۂ عمومی کو پیدا کرتی ہیں۔ ان سارے موثرات کے شعوری، نیم شعوری اور غیر شعوری عمل سے اب ایک سوچا سمجھا ہوا ارادہ پوری کی پوری قوم میں کارفرما ہو چکا ہے۔ شہر اور قصبے ہوں، یا دور افتادہ دیہات، جہاں جائیے یہ ارادۂ اجتماعی یکساں موجزن ہے۔ یہ بڑے بڑے جلسوں کی صورت میں ظہور

کرتا ہے، یہ قراردادوں اور ریزولیوشنوں کی صورت میں سامنے آتا ہے۔ یہ تقاریر اور مقالات میں امڈ رہا ہے، یہ نجی مجالس اور گفتگوؤں پر اثر انداز ہے، یہ جماعتوں اور پارٹیوں کے منشوروں اور پروگراموں میں سے بول رہا ہے۔ آخر اسے کب تک جھٹلاؤ گے؟ قوموں کے جذبات اور میلانات جب تک دھندلے ہوں تو ان کو نظر انداز کیا جاسکتا ہے، لیکن جب وہ متعین شعوری شکل اختیار کرکے ارادۂ عمومی بن جائیں تو پھر ان سے صرف نظر کرنے کی جرأت ایک حماقت کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتی۔

اب تک کی گفتگو سے یہ غلط فہمی نہ ہو کہ ہم نظریۂ جبریت کے قائل ہیں اور ہمارا خیال یہ ہے کہ کچھ ایسی نفسیاتی، اور تاریخی اور طبیعی قوتیں برسرِ عمل آگئی ہیں جس کے اندر انسانی ارادہ بالکل بے بس ہے کہ ایک خاص سمت کے سوا کسی اور طرف نہ جاسکے۔ نہیں ہم انسانی ارادہ کی طاقت کی برتری کے قائل ہیں جو اللہ تعالیٰ نے اسے دی ہے لیکن ہم یہ بتانا چاہتے ہیں کہ یہ مختلف موثر عوامل جو کارفرما ہیں ان کے تقاضے کو اگر رد کرکے چلنا ہو تو اس کی صورت ایک ہی ہو سکتی ہے اور وہ یہ کہ انسانی ارادہ ایک سخت انقلابی اقدام کے ذریعے ان عوامل سے ٹکرائے اور ان کو توڑ پھوڑ کر آگے نکل جائے۔ سوال یہ ہے کہ کیا ایسے سخت انقلابی اقدام کے لیے جو سروسامان ہوتا ہے وہ موجود ہے یا اس کے بہم پہنچانے کی تیاریاں اب تک ہماری ارادی قوتوں نے کی ہیں یا ہمارے اندر ان تیاریوں کی ضرورت ہی کا کوئی احساس موجود ہے ان میں سے کوئی بھی چیز نہیں۔ بخلاف اس کے ہمارے شعوری ارادوں نے انقلابی حرکت اگر شروع کی ہے تو ان عوامل کے خلاف جو اسلام کے خلاف پڑتے ہیں۔ لیکن وہ عوامل جو اسلام کے زیر اثر اور اسلام کے مطابق کام کر رہے ہیں ان کو ہمارے شعوری ارادوں نے قبول کر لیا ہے۔

ہم یہ بھی نہیں کہتے کہ ہمارے اندر کی کوئی طاقت ان عوامل سے آنکھیں بند کرکے اندھا دھند قدم اٹھانے کی حماقت نہیں کر سکتی۔ ضرور کر سکتی ہے، مگر ہمارا مدعا صرف یہ ہے کہ ایسی حماقت سے کبھی اچھے نتائج برآمد نہیں ہو سکتے۔ کوئی ایسا دستوری مستقبل اور کوئی ایسی سیاسی تقدیر جسے مذکورہ بالا زوردار عوامل کے خلاف قوم پر ٹھونسنے کی کوشش کی جائے وہ ایک ایسا ناخوشگوار بار گراں بن کے ہمارے اوپر لدے گی جسے اولین موقع ملتے ہی عوام سروں سے اتار پھینکیں گے۔ ایسے دستوری مستقبل اور ایسی سیاسی تقدیر کو محبت کے ساتھ نہیں، ہمیشہ نفرت اور بے دلی کے ساتھ قبول کیا جاتا ہے۔

اس کے لیے کبھی جذباتِ عمل نہیں پیدا ہوتے بلکہ جمود پیدا ہوتا ہے جو بتدریج اضطراب میں بدلتا ہے اور بالآخر انقلاب تک نوبت جا پہنچتی ہے۔ ایسی دھاندلیاں چار چھ مہینے، سال دو سال چل سکتی ہیں لیکن استقلال نہیں پا سکتیں۔ ایسے جام کے سکے ایک آدھ دن چل جاتے ہیں، اس کے بعد ان کی قدر و قیمت ختم ہو جاتی ہے۔ تاریخ انسانی میں جو بھی بے تکی چیز لا کے نصب کر دی جائے اسے تاریخی عوامل توڑ پھوڑ کے رکھ دیتے ہیں۔

یہ جو آئے دن کبھی کنٹرولڈ ڈیموکریسی اور کبھی عبوری دستور کے منصوبے نمودار ہوتے رہتے ہیں ان کے موجدوں کے لیے ہم اللہ تعالیٰ سے سمجھ بوجھ پانے کی دعا کرتے ہیں کہ خدا کے لیے اپنی قوم کی اجتماعی زندگی کے موثر عوامل سے کشتی لڑنے کا فیصلہ نہ کریں۔ اس کشتی میں کوئی پہلوان پالا نہیں مار سکتا۔

دوسری طرف ہم عوام کو یہ یقین دلانا چاہتے ہیں کہ وہ جس نظامِ زندگی کے لیے اپنے اندر ایمان اور جس کے لیے جد و جہد کرنے کا عزم رکھتے ہیں، اس کی خاطر اگر وہ انگریزی تسلط اور ہندو امپیریلزم کے خطرے سے نبرد آزما ہو کر یہاں تک آ گئے ہیں تو آئندہ بھی کوئی ناموافق صورتِ حالات ان کے آڑے نہیں آ سکتی۔ چند مہینوں اور چند سالوں کی گردشیں بظاہر کتنی ہی ناسازگار اور مایوس کن کیوں نہ ہوں، اجتماعی رجحانات اور عمومی ارادوں کا راستہ روک نہیں سکتیں۔ حالات جتنے ناسازگار رہوں زندہ قوموں کا ولولۂ عمل اتنا ہی زوردار ہو جانا چاہیے۔

تیز ترک گام زن منزلِ ما دور نیست

بقیہ (ایک ضروری استدراک) صفحہ ۶۲ اور شبہ اور گمان پر دلالت کرنے والے الفاظ بھی مروی ہیں۔ مثلاً ابن صیاد کے متعلق آپ کا حضرت عمرؓ سے یہ فرمانا کہ "اگر یہ دجال ہی ہے تو اس کے قتل کرنے والے تم نہیں ہو، اور اگر یہ وہ نہیں ہے تو تمہیں ایک ذمی کو قتل کرنے کا کوئی حق نہیں۔" یا مثلاً ایک حدیث میں آپ کا یہ ارشاد کہ "اگر وہ میری زندگی میں آ گیا تو بہ حجت سے اس کا مقابلہ کروں گا ورنہ میرے بعد میرا رب ہر مومن کا حامی و ناصر ہے ہی۔" اب یہ ظاہر ہے کہ اس دوسرے جز کی وہی اور اصولی حیثیت وہ نہیں ہے اور نہیں ہو سکتی جو پہلے جز کی ہے اس کی تمام تفصیلات کو بھی پہلے جز کی طرح یقینی قرار دینا زیادتی ہے بلکہ اس کے ہر حصے کی صحت کا دعویٰ کرنا بھی درست نہیں ہے۔"

صفحہ ۵۷ سطر ۴، ۵ کی عبارت میں یہ ترمیم کر دی جائے:

"لیکن کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ ساڑھے تیرہ سو برس گزر چکے ہیں اور ابھی تک دجال نہیں آیا ہے؟"

اسی صفحہ پر سطر ۷ تا ۹ کو اس طرح لکھا جائے:

"اس قسم کے معاملات میں اگر کوئی بات نبی کے قیاس یا گمان یا اندیشے کے مطابق نہ نکلے تو یہ اس کے منصبِ نبوت میں ہرگز قادح نہیں۔"

خاکسار ابوالاعلیٰ

نظامِ اسلامی اور اطاعتِ رسولؐ

(حدیث کا مقام نظامِ شریعت میں)

— نعیم صدیقی —

(۷)

امت کے لیے آنحضورؐ کے اسوۂ حسنہ ہونے کا منطقی تقاضا خدا کا رسولؐ جب خود اللہ تعالیٰ کی طرف سے مختلف مناصب پر مامور رہا ہو، اور وہ بالکل سرکاری حیثیت میں امت کے لیے اسوۂ حسنہ قرار پایا ہو، یعنی اپنے قول وفعل سے اسے زندگی کے ہر ہر دائرے اور شعبے میں مثالی روش کو پیش کرنا ہو تو پھر یہ بات قرینِ قیاس نہیں رہتی کہ اس سے نمونہ لینا یا نہ لینا، اس کی تقلید کرنا یا نہ کرنا، اس سے دین وشریعت کا سبق سیکھنا یا نہ سیکھنا، اس کا دامن تھام کر رہِ حیات پر چلنا یا نہ چلنا مساوی ہوں۔ یعنی وہ اسوۂ حسنہ تو ہو، اور ہر پہلو سے ہو، لیکن اس سے استفادہ کرنا بالکل امرِ اختیاری قرار دیا جائے۔ وہ انسانی زندگی کے بارے میں قرآن کے احکام کی تفسیر وتعبیر اپنے عملی مظاہرہ سے کرے تو سہی، لیکن اس کو قبول کرنا محض ایک نفلی یا مستحب نوعیت کا عمل سمجھا جائے۔ وہ اگر اسوہ ہے، اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے مستند اسوہ ہے تو ہونا یہ چاہیے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے بعد "مطاع" ہو اور اس کی پیروی واطاعت نظامِ دینی میں قطعی طور پر لازم ٹھیرے۔ وہ جس چیز کا التزام کرے، اسی میں ساری امت کے لیے التزام کرنا لازم ہو جائے۔ وہ جس چیز سے اجتناب کرے اس سے اجتناب کرنا ہر مسلمان پر واجب ٹھیرے۔ وہ جس چیز کے لیے پسندیدگی کا اظہار کرے اس میں ہر مومن کے لیے پسندیدگی پیدا ہو جائے۔ وہ جس چیز سے کراہت کرتا ہو اس میں اللہ کے ہر بندے کے لیے کراہت پیدا ہو جائے۔ وہ جس سے کٹ جائے اس سے ساری امت کٹ جائے، اور وہ جس سے جڑے اُس سے ساری امت جڑے۔ وہ جدھر سے منہ موڑے اُدھر سے ساری قوم منہ موڑ لے اور وہ جدھر رُخ کر لے ساری قوم اُدھر رُخ کر لے۔ کسی عقیدے، اصول یا حکم کے مختلف تصورات میں سے جس کو وہ ترک کر دے وہ

دنیا بھر میں ہمیشہ کے لیے متروک ہو جائے اور جس تصور و تشریح کو وہ قطعیت سے اختیار کرے اُسے اس پر بھروسہ کرنے والا پورے شرحِ صدر کے ساتھ اختیار کر لے۔ دوسرے لفظوں میں اسے بلے چون وچرا اطاعت کا مستحق ہونا چاہیے۔ اس کا مقام لازماً دین کے نظامِ اطاعت کی ایک مستقل کڑی کا ہوگا جس کو بیچ میں سے نکال دینے سے سرے سے سلسلۂ اطاعت قائم ہی نہ رہ سکے گا۔

رسول ؐ کے اسوۂ حسنہ ہونے کا یہ منطقی تقاضا کہ وہ نظامِ اطاعت کی ایک مستقل کڑی ہو، ٹھیک اسی طرح قرآن کی طرف سے پیش کیا گیا ہے۔ قرآن رسول ؐ کو اس حیثیت سے ایک جگہ نہیں، بار بار پیش کرتا ہے۔ اس معاملے میں اس درجہ تکرار و تصریف سے کام لیا گیا ہے کہ کسی اشتباہ کی گنجائش رہتی ہی نہیں۔ کہنا یوں چاہیے کہ قرآن — پورے کے پورے قرآن — نے آنحضور صلعم کو صرف اسی حیثیت میں پیش کیا ہے۔ لیکن اس معاملے کی مرکزی آیت سورۂ نساء میں ہمارے سامنے آتی ہے اور ایسے سیاق سباق میں آتی ہے کہ سلسلۂ کلام کو سامنے رکھتے ہوئے صرف کوئی کندۂ ناتراش ہی یہ گمان باندھ سکتا ہے کہ رسول ؐ نے خدا کی کتاب پہنچائی اور اس پر اس کا کام ختم ہو گیا، امت کے لیے اُس کے پاس اور کچھ نہیں ہے، اور وہ اپنے اندر اور کسی لحاظ سے کوئی اتھارٹی نہیں رکھتا۔ سورج پر مٹی ڈالنے والا شخص اُس سے کم درجہ کا احمق ہوگا جو منصبِ رسالت کے بارے میں قرآن کے دئیے ہوئے روشن اور واضح اور صریح تصورات کو خیالاتِ پریشان کا غبار اڑا اڑا کر ڈھانپ دینا چاہتا ہے۔ ایسے لوگوں کے لیے اور کوئی راستہ اس کے سوا نہیں ہے کہ وہ قرآن کی آیات کو مسخ کریں اور اس کے ایک ایک لفظ سے لڑائی لڑیں۔

سرکاری گواہ | سورۂ نساء اپنے نظامِ مطالب کے لحاظ سے اُن معرکہ آرا سورتوں میں سے ایک ہے جو اسلامی نظامِ تمدن و معاشرہ کے لیے اصول، اساسیات، قوانین، اخلاقی ہدایات اور ضروری مسالہ فراہم کرتی ہیں۔ چنانچہ مختلف سیاسی اور تمدنی اور معاشی اوامر و نواہی کا بیان ہوتے ہوتے سلسلۂ کلام ذیل کی ایک اہم حقیقت کو ابھار لاتا ہے:

فَكَيْفَ اِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ اُمَّةٍ بِشَهِيْدٍ وَّجِئْنَا بِكَ عَلٰى هٰٓؤُلَآءِ شَهِيْدًا ۞ يَوْمَئِذٍ يَّوَدُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَعَصَوُا الرَّسُوْلَ لَوْ تُسَوّٰى بِهِمُ الْاَرْضُ ؕ وَلَا يَكْتُمُوْنَ اللّٰهَ حَدِيْثًا ۞	پھر کیا حال ہوگا اس وقت جب ہم ہر امت کے اندر سے (خود اس کے بارے میں کوئی) گواہ اٹھا کھڑا کریں گے، اور (اسے محمد صلعم) ان لوگوں پر آپ کو شہادت کے لیے طلب کریں گے۔ اس دن وہ لوگ جنہوں نے انکار کی روش اختیار

کی ہو گی، اور جنہوں نے رسولؐ کی نافرمانی کی ہو گی، یہ آرزو
کریں گے کہ کاش کہ ان کو مٹی میں ملا دیا جائے ۔۔۔ اور وہ اللہ تعالیٰ (النساء آیت ۴۲-۴۱)
سے (حقیقت حال کے بارے میں) کوئی بات چھپا نہ سکیں گے۔

مراد یہ ہے کہ یہی رسول جو آج تم کو ایک نظامِ خیر و برکت کا درس دے رہا ہے جو تمہارے سامنے خیر و فلاح کی راہیں کھول رہا ہے، اور جو محض استدلال سے حق کو تمہارے سامنے رکھ رہا ہے اور تمہارے دلوں میں زبردستی اپنی تعلیم کو نہیں اتار سکتا، جس کا تم مذاق اڑاتے ہو، جس سے تم بچتے ہو، جس کا ڈٹ کر انکار کرتے ہو، جس کی خیر خواہی کا جواب غصے اور نفرت سے دیتے ہو، جس کے راستے میں روڑے اٹکاتے ہو، اور پھر نفاق کی نقاب اوڑھ کر جس کی دعوت پر ایمان لانے کے اقرار کے بعد پھر جس کی نافرمانی کرتے ہو، جس کی اتھارٹی کے آگے سرِ اطاعت خم نہیں کر دیتے، یہی رسول کل عدالتِ آخرت میں ان تمام واقعات و احوال کا سرکاری گواہ بن کے کھڑا ہو گا اور وہ اپنی شہادت دیتے ہوئے ایک طرف یہ واضح کرے گا کہ اس نے ہدایت کو پہنچانے میں، دین حق کا پیغام سنانے میں، ایک پاکیزہ معاشرہ کے قیام میں منشائے الٰہی کی تشریح و توضیح میں، احکام ھُدیٰ کے مطابق عملی نمونہ پیش کرنے میں اپنی سی کوشش کرنے میں کوئی کوتاہی نہیں کی تھی، اور دوسری طرف وہ تمہارے کرتوتوں کے پول کھولے گا کہ کس نے ایمان کا ثبوت دیا اور کس نے انکار کی روش اختیار کی، کس نے خدا کو مانا تو اس کے ساتھ رسول کی اطاعت بھی کی اور کس نے رسول کی نافرمانی میں اپنی عاقبت کو برباد کیا۔

رسول اللہ کی یہ گواہ ہونے کی حیثیت دوگونہ ہے: ایک طرف آپ بندوں کے سامنے اللہ تعالیٰ کی جانب سے اُس حقیقتِ غیبی کے گواہ ہیں جس کو زندگی کی اساس بنانے ہی میں ساری خیر و فلاح مضمر ہے۔ دوسری طرف آپ اپنی مخاطب قوم اور اپنی پیرو امت کے بارے میں اللہ تعالیٰ کی عدالتِ محاسبہ میں گواہ بنا کے کھڑے کیے جائیں گے کہ اس قوم اور اس امت نے خدا کے دین کا استقبال کس طرح کیا اور خود رسول کے احکام اور اسوہ کے ساتھ کیا روش اختیار کی؟ یہ منصبِ شہادت خود بتاتا ہے کہ جملہ انبیاء و رسل کی طرح آنحضورؐ نظامِ دینی میں ایک اہم اتھارٹی ہیں۔ آپؐ نرے قاصد نہیں کہ وحی کا ریکارڈ سنا دیں، بلکہ آپ کے ذمے چونکہ اسلامی معاشرہ کی تعمیر اور اسلامی ریاست کو عملاً بروئے کار لانے اور ایک صالح امت اور ایک پاکیزہ سوسائٹی کو استوار کرنے کا فریضہ ہے۔ جس میں آپؐ کو پوری پوری

نگاہ رکھنی ہے کہ مخاطبین آپؐ کی دعوت پر کیا ردِ عمل دکھاتے ہیں، آپؐ کے پیغام کا کیا جواب دیتے ہیں، آپؐ کی اُمت آپؐ کی تعلیم کو کس حد تک جذب کرتی ہے۔ آپؐ پر ایمان لانے کا دعویٰ کرنے والے اپنے دعوے کو کس حد تک نبھاتے ہیں۔ آپؐ کا پیش کردہ نمونہ کہاں تک اختیار کیا جاتا ہے؟ یہ اتھارٹی ایک معمارِ ملت کی اتھارٹی ہے یہ ذمہ داری ایک ناظمِ اجتماعیت کی ذمہ داری ہے، یہ منصب ایک مکمل لیڈر کا منصب ہے۔ یہ کچھ اس نوعیت کا عہدہ ہے کہ جیسے ایک بادشاہ کا بھیجا ہوا نائب اس کی کسی نوآبادی میں رعایا کے سامنے بادشاہ کی مرضیات کا نمائندہ و گواہ ہو اور دوسری طرف خود بادشاہ کے سامنے وہ رعایا کے طرزِ عمل کے بارے میں اپنی رپورٹوں کے ذریعے شہادتِ حق پیش کرنے والا ہو۔ پھر اگر اُس رعایا کے مختلف افراد و عناصر کے محاسبہ کی گھڑی آجائے اور وفاداروں اور باغیوں اور فتنہ گردوں اور چھپے غداروں کے اعمال کی جانچ پڑتال کے لیے خود بادشاہ کی اپنی تحقیقاتی عدالت کارروائی شروع کردے تو ہر مقدمے میں سب سے اہم شہادت بادشاہ کے نائب کی ہوگی جو سرکاری اتھارٹی کے ساتھ گواہ کے کٹہرے میں آئے گا اور اس کی دعوت اور تعلیم کا جس جس نے جو جو جواب پیش کیا ہوگا اسے بھی سامنے رکھ دے گا اور خود اس نائب کے احکام اور اس کی دی ہوئی ہدایات میں فرماں برداری اور نافرمانی کی جیسی جیسی روش کسی نے دکھائی ہوگی اس کی رپورٹ بھی پیش کردے گا، اور اس کے قائم کردہ اسوہ اور نمونہ اور نظیر کو جیسی جیسی وقعت کسی نے دی ہوگی اس کا حال بھی بلا کم و کاست وہ پیش کردے گا۔

مذکورہ بالا آیت صراحت کرتی ہے کہ رسول اللہ کی شہادت جن لوگوں کے خلاف پڑے گی ان پر دو چیزوں کی وجہ سے گرفت ہوگی: ایک خدا کے دین کے خلاف کفر و انکار کی روش، دوسرے رسولؐ کی نافرمانی! یہ شہادت جس کے خلاف پڑ گئی وہ اس وقت کوئی راہِ نجات نہ پا کر یہ کہے گا کہ کاش کہ میں انسان نہ ہوتا اور مٹی میں ملا دیا گیا ہوتا۔ یہاں غور کیجیے تو "عَصَوُا الرَّسُوْلَ" کے الفاظ بڑے اہم ہیں۔ نہیں کہا کہ "اللہ کی نافرمانی کی"، کیونکہ اس کا مفہوم "کفروا" میں ادا ہو چکا، نہیں کہا کہ قرآن سے روگردانی کی، بلکہ نہایت کھلے لفظوں میں کہا تو یہ کہا کہ "رسولؐ کی نافرمانی کی"۔ آخر منصبِ رسالت میں کوئی اتھارٹی تھی تو زور دے کر رسول کی نافرمانی کا ذکر کیا گیا۔

یہود کی گمراہی کا راز اس کے بعد پھر کچھ احکام و ہدایات بیان ہوتے ہیں، اور یکایک بیچ میں اُس مفسد گروہ کا ذکر آتا ہے جو اللہ کی کتاب پا لینے کے بعد ضلالت کے گاہک بنے اور خود تو گمراہ تھے ہی، اب مسلمانوں کو بھی الفاظِ کتاب

کھیل کھیلاتے تھے اور راہِ حق سے ہٹانے جانے کی کوشش میں دن رات سرگرم تھے۔ یعنی یہود! ان لوگوں کی گمراہی کا راز کیا تھا؟ جواب دیا جاتا ہے کہ "یُحَرِّفُونَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهِ" (النساء۔ آیت ۴) یعنی الفاظ کو ان کے حقیقی محلِ استعمال اور ان کے سیدھے صاف مفہوم سے ہٹا کر کہیں کا کہیں لے جاتے ہیں۔ کتابِ الٰہی کے الفاظ سے کھیلنے کی یہ چھوٹ ان کو اس لیے ملی کہ ان کے ہاں اسوۂ انبیاء کی مشعل گل ہو چکی تھی اور صراطِ مستقیم کے جو نشانات خدا کے رسولوں کی عملی زندگی نے نصب کیے تھے اور فہمِ کتاب کے جو سنگ میل وہ کھڑے کر گئے تھے وہ امتدادِ زمانہ ـــ اور یہود کی لاپروائیوں کی وجہ سے ـــ مٹ مٹا گئے۔ اب جب الفاظِ کتاب سے سنتِ انبیاء کا پہرہ اٹھ گیا تو ان کے ساتھ تاویل کا ہر کھیل کھیلنا آسان تھا۔ جس مفہوم کو یہود کے پادریوں نے چاہا الفاظِ کتاب سے نکال باہر کیا اور جس ماڈرن مفہوم کو چاہا داخل کر دیا۔ بات یہیں تک نہیں رہی، معنی کی یہ تحریف بالآخر خود الفاظ کی تحریف پر منتج ہو کے رہی۔

یہود کے اس ذہنی بگاڑ کی تازہ ترین شہادت کو قرآن نے مسلمانوں کے سامنے رکھ دیا کہ دیکھ لو، ان کا حال کیا ہے! ان کی تصویر یہ کھینچی گئی کہ وہ مسلمانوں کے مجمعوں میں آکر بیٹھتے ہیں، نبی صلعم کے خطابات کو سنتے ہیں اور پھر سیدھی طرح سمعنا و اطعنا کہنے کے بجائے مسخرے پن کے ساتھ "سمعنا وعصینا" اس طرح کہتے ہیں کہ ایک طرف تو آس پاس بیٹھنے والوں کی نگاہ میں رسول اللہ کے کلام کی سبکی ہو، دوسری طرف اگر کوئی مسلمان گرفت کرے تو دو متضاد کلموں کی آواز کی مشابہت کے پردے میں اپنا جرم یہ کہہ کر چھپا سکیں کہ صاحب! ہم نے تو "اطعنا" کہا تھا آپ کو سہو ہوا کہ آپ نے "عصینا" سمجھا! اسی طرح وہ "وَاسْمَعْ غَيْرَ مُسْمَعٍ" کا جملہ بولتے کہ جس کے دو مفہوم تھے، بظاہر یہ کہ "حضور! ذرا سنیے! خدا کرے آپ کی بات کو کوئی ردّ کرنے والا نہ ہو" اور بباطن یہ کہ "سنیے، خدا کرے کہ آپ کچھ نہ سن پائیں"۔ اس سے مطلوب یہ تھا کہ رسول اللہ صلعم کا مذاق اڑے اور مسلمانوں میں بے وقری ہو، لیکن اگر کوئی ٹوکے تو کہہ دیا جائے کہ صاحب، یہ تو ہم ایک اچھی دعا کرتے ہیں۔ اسی طرح وہ مجالس میں بیٹھ کر آنحضورؐ سے خطاب کرتے ہوئے کہتے "راعنا" یعنی "ذرا ہماری طرف توجہ فرمائیے"! حالانکہ اس کا دوسرا نمایاں مفہوم یہ بھی تھا کہ "اے ہمارے چرواہے"! یہاں بھی اس دورنگی کلام سے مقصود یہ ہوتا تھا کہ آنحضور صلعم کے خلاف تمسخر و استہزاء کی ایک فضا برپا ہو، لیکن کسی طرف سے گرفت ہو تو اچھے مفہوم کو سامنے رکھ کر کہا جائے کہ واہ جناب، آپ نے ہمیں اتنا نامعقول آدمی سمجھا ہے کہ اتنی غیر شریفانہ بات

ہم کہہ سکتے ہیں!

اس تازہ شہادت سے ایک طرف ان حالات پر تبصرہ ہو جاتا ہے جن سے آنحضور اور مسلمان گزر رہے تھے، اور دوسری طرف یہ حقیقت ان کے ذریعے کھل جاتی ہے کہ جو اُمت رسولوں کے اسوہ کی شمع گل کر بیٹھتی ہے وہ پھر کتاب کے الفاظ سے جو مذاق چاہے روا رکھتی ہے۔ نیز جن لوگوں کے اندر رسول کا احترام موجود نہ ہو، اور وہ اُس کی اتھارٹی پر اعتماد نہ رکھتے ہوں تو پھر سرے سے وحی اور ہدایت اور دین اور قانون کا بھی کوئی وقار باقی نہیں رہ جاتا۔

اس آیت ۴۶ کے بعد آیت ۴۷ میں مسلمانوں کو سخت انتباہ دیا ہے کہ خبردار ایسی روش اختیار نہ کرنا کہ تم بھی ان لوگوں کی طرح لعنت زدہ ہو کر رہ جاؤ۔ پھر اشارہ کیا ہے۔ یہود کے اس گروہ کی طرف جسے قرآن نے "اصحاب سبت" کا خاص لقب دیا ہے۔ یہ وہ گروہ تھا جس نے خدا کے ایک حکم کے الفاظ تو خدا کے نبی سے ٹھیک وہی لے لیے جو وحی بن کر آئے تھے، لیکن ان الفاظ کا عملی مفہوم نبی کے اسوہ سے قبول کرنے کے بجائے اُن کو آزاد تاویلات کا کھلونا بنا لیا۔ خدا کا حکم مذاق بن کے رہ گیا، کیونکہ بظاہر حکم پورا بھی ہو رہا تھا اور مچھلیاں بھی دل کھول کر پکڑی جا رہی تھیں۔ مسلمانوں کو اشارات میں یہاں یہ درس دیا گیا ہے کہ اگر تم نے بھی اسی طرح الفاظ کو رسول کے اسوہ سے الگ کر کے لیا اور اُن سے کھیلنے پر آ آئے تو اس انجام کو پہنچو گے جس تک اصحاب سبت اور ان کے پیروکار پہنچے ہیں۔

یہ وہ اصل وجہ فساد ہے جس کے زیر اثر ایک طرف تو یہود کو یہ سعادت ملی کہ "اُوتوا نصیباً من الکتٰب" (آیت ۵۱) یعنی اللہ تعالیٰ کے وحی کردہ نوشتہ سے ان کا دامن مالا مال ہوا، دوسری طرف یہ پستی کہ "یؤمنون بالجبت والطاغوت" یعنی بتوں کی پوجا ہے اور شیطان کی مریدی ہے! رسالت کو کتاب کے فہم میں اتھارٹی نہ ماننے اور الفاظ میں سے من مانے معنی تلاش کرنے کی آزادی کا نتیجہ یہی تو ہو سکتا ہے۔

اسلامی نظام کے دو تقاضے اب ہم اُس مرکزی آیت کے قریب تر آ گئے ہیں جو ہمارے استدلال کی تعمیر کا کونے کا پتھر ہے۔ نساء کی آیت ۵۴ میں یہود کے اس قومی جذبۂ حسد کی طرف اشارہ ہے جو امت مسلمہ کے لیے ان کے دلوں میں کارفرما تھا۔ اور اس کی وجہ بھی بتا دی کہ "فقد اٰتینا اٰل ابراھیم الکتٰب والحکمۃ واٰتینٰھم ملکاً عظیماً" یعنی ہم نے ابراہیمؑ کے خانوادے کو اپنی الہامی ہدایت سے، اس پر کاربند ہونے کے لیے نبی صلعم کی پیش کردہ حکمت سے، اور پھر اس کے مطابق ایک اجتماعی نظام تعمیر کرنے کے لیے عظیم الشان سلطنت سے نوازا ہے۔ ضمناً اس سلسلۂ کلام

میں بتایا جاتا ہے کہ جس دعوت کے ذریعہ یہ نعمتیں دی جا رہی ہیں ایک گروہ اُس پر ایمان لانے والوں کا ہے، دوسرا گروہ اس کی راہ روکنے والوں کا ہے۔ پھر دونوں کا انجام بیان ہوا ہے (آیت ۵۵، ۵۶، ۵۷) اب سلسلۂ کلام یہاں پر آتا ہے کہ عظیم الشان سلطنت کی صورت میں کتاب و حکمت کی بنیاد پر جو نظامِ اجتماعی استوار کیا جا رہا ہے اس کے دو اصولی تقاضے کون سے ہیں کہ جن کے بغیر یہ ایک دن نہیں چل سکتا۔ فرمایا:

اِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰٓى اَهْلِهَا ۙ وَاِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْكُمُوْا بِالْعَدْلِ ۭ (النسآء - ۵۸)

اللہ تم کو حکم دیتا ہے کہ امانات (بالخصوص قیادت اور اقتدار کی امانت) کو ان کے حقداروں کو سونپو، اور جب تم لوگوں کے درمیان معاملات چکانے کے لیے (عدالت کی کرسی پر) بیٹھو تو انصاف کے ساتھ فیصلے کرو۔

عظیم الشان سلطنت پر گفتگو کرتے ہوئے موقع کا جو کچھ تقاضا تھا وہ اس آیت سے پورا ہوتا ہے۔ یعنی اسلامی نظامِ حیات کے دو امتیازی پہلو حکیمانہ انداز کے ساتھ بیان کر دیے گئے ایک ادائے امانت، دوسرا انصاف سے معاملات طے کرنا۔ ادائے امانت اور انصاف سے معاملات کو چکانا یوں تو اپنے اخلاقی مفہوم کے لحاظ سے زندگی کے جزئی سے جزئی معاملے تک وسیع ہیں، لیکن سلسلۂ گفتگو کے لحاظ سے اس عموم کو خصوصیت حاصل ہو جاتی ہے اجتماعی نظم کے خاص تقاضوں کو، یعنی ایک یہ کہ مناصبِ اقتدار کو بہ حیثیت مقدس امانت کے ہمیشہ اہل لوگوں کے حوالے کیا جائے۔ دوسرے یہ کہ اقتدار کی مسند پر بیٹھ کر جو لوگ معاملات کا تصفیہ کرنے کی ذمہ داری سر لیں وہ اصولِ عدل کو شمع راہ بنائیں۔ ایک طرف صالح قیادت ہو، دوسری طرف صالح اصول ہوں تو جب ایک صالح معاشرہ تشکیل پا سکتا ہے اور ایک اسلامی سلطنت چل سکتی ہے۔

اسلامی ریاست کا نظام سمع و طاعت یہ اشارات دینے کے بعد اب قرآن واضح کرتا ہے کہ اسلامی معاشرہ اور اسلامی ریاست کس نظامِ سمع و طاعت پر چلتا ہے۔ نظامِ سمع و طاعت کسی بھی نظام کی ریڑھ کی ہڈی ہوتا ہے۔ اور اسی لیے دنیا کی ہر ریاست اور معاشرہ اس کو تعین سے بالعموم اپنے دستورِ اساسی میں بیان کر دیتا ہے۔ ٹھیک اسی اہمیت کے ساتھ قرآن نے اسلامی نظامِ طاعت کے مراتب کو ایک دینی اصول کی حیثیت سے بھی، اور ایک دستوری دفعہ کی حیثیت سے بھی مسلمانوں کے سامنے رکھ دیا ہے۔ اس معاملے میں پیشِ نظر آیت اتنی اہم ہے کہ ہمارے ہاں یہ بڑی وسیع دستوری بحثوں کا

مرکز و محور قرار پائی ہے۔ ملاحظہ ہو:

یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَ اَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَ اُولِی الْاَمْرِ مِنْکُمْ ؕ

اے اہل ایمان! اطاعت کرو اللہ کی، اور اطاعت کرو رسولؐ کی، اور ان کی بھی جو تم میں سے معاملات کی باگ دوڑ سنبھالنے والے ہیں۔

جیسا کہ ہم پہلے عرض کر چکے ہیں سلسلۂ کلام گواہ ہے کہ اجتماعی نظام کے مسائل زیر بحث ہیں اور اسلامی معاشرہ کی ضروریات ہیں کہ جن پر گفتگو ہو رہی ہے، گویا پورے کا پورا دین، پورے کے پورے شعبہ ہائے حیات، پورے کے پورے انسانی معاملات ہیں کہ جن کے بارے میں یہ حقیقت واضح کرنا مقصود ہے کہ کام کس نظامِ طاعت پر چلنا ہے اور کون کیا اختیار رکھتا ہے۔

تین مراتبِ اطاعت اس آیت کو سیدھے سادے طریق سے پڑھیے، سیدھے سادے طریق سے اس کا ترجمہ کیجیے کسی نکتہ طرازی اور کسی منطق آرائی کی ضرورت نہیں۔ کسی ادنچ نیچ کا موقع نہیں، کسی الجھاؤ اور سلجھاؤ کا مقام نہیں، بات بالکل صاف ہے۔ کہا جاتا ہے کہ "اطاعت کرو اللہ کی"، پھر کہا جاتا ہے کہ "اطاعت کرو رسولؐ کی"، اور آخر میں کہا جاتا ہے کہ اطاعت کرو اپنے اہلِ امر کی"۔ فوراً پہلا سوال یہ اٹھ کھڑا ہوگا کہ اس آیت میں مراتبِ اطاعت کتنے ہیں؟ ایک صاف ستھرا ذہن جب بھی اس سوال کا جواب خود آیت سے مانگے گا تو اسے معلوم ہوگا کہ مراتب اطاعت تین ہیں، لیکن وہ اگر سوال کا جواب دریافت کرے گا منکرین حدیث سے، تو وہ بتائیں گے کہ مراتبِ طاعت دو ہیں! وہ پوچھے گا کہ حضرت، تین چیزیں کونسی ریاضی کی رُو سے دو ہو جاتی ہیں؟ اس پر ان کو بتایا جائے گا کہ حدیث کا انکار کرنے سے وہ ریاضی آدمی پر منکشف ہوتی ہے جس کا فارمولا یہ ہے کہ تین برابر ہوتے ہیں دو کے (۳ = ۲)۔ سائل مزید پریشانی کا اظہار کرے گا تو اسے پہلے تو ملاؤں کے خلاف مغلظات کا ایک ڈوز پلایا جائے گا، پھر احادیث کے خلاف ایک تقریر کانوں میں ٹھونسی جائے گی اور پھر جب اس بچارے کا سر بالکل چکرا جائے گا تو اسے تفسیری نکات یوں بتائے جائیں گے کہ خدا کی اطاعت تو ہوئی خدا کی اطاعت، یعنی قرآن پر کاربند ہونا۔ اس کے بعد آئی رسولؐ کی اطاعت: سو رسول تو خود قرآن ہی کا چاہنے والا اور قرآن ہی کو پیش کرنے والا ہے۔ لہٰذا رسولؐ کی اطاعت سے مراد بھی وہی پہلی چیز ہوئی کہ خدا کی اطاعت کی جائے اور قرآن کا دامن تھاما جائے۔ رہی اگلی چیز، تو عملاً اسلامی ریاست کے کارپردازوں کی اطاعت

کئے بغیر تو اجتماعی نظام چلتا نہیں۔ پس اطاعتیں دو ہی تحقیق ہوئیں، ایک اللہ (قرآن) کی اطاعت، دوسری حکومتِ وقت (پارلیمنٹ) کی اطاعت! اللہ اللہ خیر سلا! رسولؐ بیچ میں سے صاف غائب۔

ملاحظہ فرمائیے، وہی بیہودہ الافسادِ ذہن، کہ رسولؐ کا دامن چھوڑا، اس کی سنت اور اس کے اسوہ کی اہمیت نگاہ سے ہٹی تو اس کے بعد لازمی نتیجہ کے طور پر الفاظِ کتاب سے کھیل شروع ہو گیا، اور مسخ و تحریف کی ایسی بدیہی مثالیں پیدا ہونے لگیں، بلکہ چھاپ چھاپ کر پھیلائی جانے لگیں! ان مفسرینِ قرآن سے کوئی پوچھے کہ ایسے اہم موقع کلام پر نظامِ اسلامی کی ریڑھ کی ہڈی کے طور پر ایک حقیقت بیان کرتے ہوئے قرآن سے ایسے گنجلک اسلوبِ گفتگو کی توقع کی جا سکتی ہے کہ مراتبِ اطاعت ہوں تو دو، لیکن وہ تین بن کے سامنے آئیں اور ان کو پھر دو کی شکل میں لانے کے لیے عظیم الشان ہیر پھیر کرنا لازم ہو جائے، اور اسی ہیر پھیر کے لیے امت تیرہ صدیوں تک ایک مستقل گردہ کے انتظار میں ٹامک ٹوئیے مارتی رہے۔ بات یوں کہی جا سکتی تھی کہ اطیعوا اللّٰہ واولی الامر منکم یا "اطیعوا القرآن و اولی الامر منکم" لیکن یہ صاف صاف طریقہ چھوڑ کر قرآن کا معیارِ فصاحت و بلاغت ایسا بیان اختیار کرتا ہے کہ جس میں "اطیعوا اللّٰہ و اطیعوا الرّسول" کو "اطیعوا اللّٰہ" کے ہم معنی قرار دینا پڑتا ہے اور اس کے لیے قرآن پر بڑی معرفت آرائی کی ضرورت پیش آئی ہے۔

لیکن کیا کل یہ ممکن نہیں کہ کوئی شخص اپنی مفسرانہ ذہانت کا یوں مظاہرہ کرے کہ "اولی الامر" کی اطاعت بھی مطلوب ہے۔ اللہ تعالیٰ ہی کی اطاعت کے لیے، لہٰذا آیت کا مطالبہ صرف ایک ہی ہے کہ اللہ کی اطاعت کی جائے۔ باقی رسول جا چکا اور اولی الامر کوئی مستقل حیثیت نہیں رکھتے، لہٰذا مرتبۂ اطاعت صرف ایک ہی اس آیت میں بیان ہوا ہے۔ دوسرے دو تو یونہی ایک زینتِ کلام ہیں۔

اس ماڈرن قسم کی معرفتِ قرآنی کی بھول بھلیاں سے نکل آئیے تو تینوں مراتبِ اطاعت نکھر کر سامنے آجاتے ہیں اور ان کے بارے میں آیت کو سیدھے سادے طریق سے پڑھنے میں ذرہ بھر اشکال نہیں پیدا ہوتا۔ ہم ان مراتب کو الگ الگ لیتے ہیں۔

۱۔ **خدا کی اطاعت** آیت میں "اطیعوا اللّٰہ" کے الفاظ فی الواقع اس اصل اطاعت کو پیش کرتے ہیں جو کسی دوسری اطاعت کا تقاضا ان کے نہیں، بلکہ بجائے خود ایک تقاضا بن کر سامنے آتی ہے۔ یہ اطاعت اس تعلق پر مبنی ہے، جو

خدا اور بندے کے درمیان ہے۔ جس خدا نے پیدا کیا، جس کی دی ہوئی قوتوں اور صلاحیتوں کے ساتھ زندگی بسر ہوتی ہے، جس کے رزق پر بندے پلتے ہیں، جس کی ہدایت کے نور سے فوز و فلاح کے راستے پاتے ہیں، وہ آپ سے آپ حق رکھتا ہے کہ بندوں سے اطاعت کا مطالبہ کرے اور بندوں پر لازم آتا ہے کہ وہ بندے ہونے کی وجہ سے اس کی اطاعت کریں۔ اس لحاظ سے یہ اصل اطاعت ہے کہ ہر دوسری اطاعت کو اس کے اوپر مبنی ہونا چاہیے، اس کے تحت ہونا چاہیے، اور اس کے تقاضا ہونے کی حیثیت سے بندوں پر واجب ہونا چاہیے۔

یہ اطاعت واحد صاحبِ حاکمیت (SOVEREIGN) ہستی کے مالک الملک اور آمرِ مطلق ہونے کا تقاضا ہے۔ اس اطاعت کی حدود مقرر کرنے والا وہ خود ہے، کوئی دوسرا نہیں، اس کے دائرہ کی وسعتوں کا تعین کرنے والا تنہا وہی ہے، اسی کا امر اور اسی کا حکم آخری معیار اور آخری سند ہے۔ کوئی دوسری کسوٹی نہیں جو اس کی مرضیات اور اس کے احکام اور اس کی ہدایات کے قابلِ قبول ہونے یا نہ ہونے کا فیصلہ کرے، اس کی مرضی ہی واحد کسوٹی ہے۔ اس کی مرضی کے خلاف کسی اور کے لیے اطاعت نہیں ہے، کیونکہ اپنے کسی حق کی بنا پر کوئی اور اطاعت کا استحقاق نہیں رکھتا۔

۲۔ **رسولؐ کی اطاعت** خدا مادیت و بشریت سے ایک منزہ ہستی ہے، لہٰذا اس امر کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ وہ خود تنزیہہ کی بلندیوں سے اترے اور تجسم کی مادی پستی میں نمودار ہو، وہ انسانی زندگی کے معاملات میں ایک عملی رہنما بن کے چلے اور پھر سوسائٹی سے مطالبہ کرے کہ سب لوگ میرے نقشِ قدم پر چلیں۔ وہ آدمیوں میں آدمیوں کی طرح رہ کر دکھائے کہ اسے کیا طرزِ عمل مطلوب ہے۔ وہ کاروبار کرے اور کاروباریوں کے لیے نمونہ بنے۔ وہ خاندانی زندگی کا قوام ہو اور قوامین کے لیے طرزِ عمل متعین کرے، وہ کسی کا باپ ہو اور ابوت کا صحیح مسلک سامنے لائے، وہ کسی کا بیٹا ہو اور شانِ فرزندی کی مثال قائم کرے، وہ کسی کا آقا اور کسی کا غلام ہو اور آقائی و غلامی کا بہترین اسلوب پیش کرے، وہ معلم، متعلم، حاکم، سپہ سالار اور جج بن کر مختلف فرائض انجام دے اور ان فرائض کی ادائی کے لیے دوسروں کو عملی روشنی بہم پہنچا دے۔ نوعِ انسانی کی یہ ضرورت کہ وہ انسانوں ہی کے ذریعے زندگی کا سبق لے سکتی ہے، اس کی مقتضی ہوئی کہ اس کے اندر سے انسانوں ہی کو اس کی اصلاح و تعمیر کے لیے اٹھایا جائے۔ چنانچہ عملی نمونہ پیش کرنا تو الگ رہا، اللہ تعالیٰ نے تو براہِ راست جملہ افرادِ انسانی سے کلام بھی نہیں فرمایا، براہِ راست تو وحی بھی نہیں اتاری، براہِ راست قرآن بھی پیش نہیں کیا۔ قرآن بھی اتارا تو بیچ میں ایک پیکرِ انسانی کو واسطہ بنا کر اتارا۔ خود اس منتخب روزگار پیکرِ انسانی کو بھی

قرآن اپنے ایک فرشتۂ امین کے ذریعے عطا فرمایا۔ اُس نے انسانوں کے اندر سے ہر دور میں خود انسان ہی منصبِ نبوت و رسالت کے لیے چُنے اور پھر اُن کو اتھارٹی دے کر بندوں سے مطالبہ کیا کہ میری اطاعت کرو، اور اس طرح کرو کہ یہ شخص تم سے جو کچھ کہے اس کی اطاعت کرو۔ یہ ہمارا مستند نمائندہ و ترجمان ہے! یہ ہمارے احکام کا پہنچانے والا بھی ہے اور ان کا مستقل شارح اور مفسر بھی! یہ تعلیم دینے والا بھی ہے اور عملاً اس تعلیم کے مطابق ہر پہلو سے نمونہ پیش کرنے والا بھی۔ پس رسولؐ اس معنی میں اطاعت کا مستحق ہے کہ وہ جس جس چیز کا حکم دیتا ہے اور جس جس سے روکتا ہے عین اللہ کی اطاعت کرتے ہوئے حکم دیتا اور روکتا ہے۔ اور پھر اللہ کی اطاعت کرانے کے لیے حکم دیتا اور روکتا ہے۔ یہ دوسری اطاعت پہلی اطاعت کو اختیار کرنے کا عملی ذریعہ ہے۔ یہ بادشاہ کے بھیجے ہوئے ترجمان یا تاج کے نمائندے کی اطاعت ہے کہ جو ہر قول اور اقدام میں سرکاری پالیسی کا پابند۔ اور اس کا شارح ہے۔ رسولؐ جب نمائندۂ تاج اور ترجمانِ شاہی کی حیثیت اختیار کر لیتا ہے تو شاہی ہدایت و نگرانی کے تحت وہ ایک ایسی عظیم اتھارٹی سے سرفراز ہو جاتا ہے کہ جو گرہ وہ ڈال دے اسے کھولنے کا اختیار کسی کے لیے نہیں رہتا۔ اور جس گرہ کو وہ کھول دے اسے ڈالنے کا مجاز اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ وہ جدھر چلے گا ساری خدائی کو اُدھر چلنا ہو گا اور وہ جدھر سے قدم روک لے گا اُدھر سے پورے نظامِ حیات کے قدم رُک جائیں گے۔ اس کی مہر جس تحریر پر ثبت ہو گئی اس کا ایک ایک حرف اٹل ہو جائے گا، اور اس کے دربار سے جو نوشتہ مسترد ہو گیا اسے کہیں قبولیت نہ ملے گی۔

وہ لوگ جو زورِ ادب کے ساتھ استدلال کی ہَوا باندھ کے ہم سے یہ منوانا چاہتے ہیں کہ مذکورہ بالا آیت میں "اطیعوا الرسول" کا مطالبہ سوائے قرآن کے اور کسی چیز کی اطاعت کو شامل نہیں ہے تو للہ! وہ یہ رازِ سربستہ بھی تو کھول دیں کہ پھر "اطیعوا اللہ" میں قرآن سے بالاتر اور قرآن کے علاوہ کونسی چیز ہے کہ جس کے لیے مطالبۂ اطاعت کیا گیا ہے۔ کیا یہ محض لفظوں کا اسراف ہے؟ ہاں، ہم اُن سے خدا کا واسطہ دلا کر پوچھتے ہیں کہ اپنی خالص قرآنی فکر کے ساتھ وہ منطق، نحو، ادب، بلاغت وغیرہ کے سارے قواعد میں اجتہاد کر کے اس رمز کا بھی تو انکشاف فرما دیں کہ اگر اطیعوا اللہ اور اطیعوا الرسول دو ہم معنی کلمات ہیں تو کیوں ایسا ہوا کہ "اطیعوا اللہ والرسول" وہ اسلوبِ بیان یہاں اختیار نہ کیا گیا۔ جو دوسری جگہوں پر آتا ہے اور جس میں تاویل بازی کے دروازے کچھ نہ کچھ کھلے رہتے ہیں۔ یہ دوسری بار "اطیعوا" کا ہے کے لیے ہے۔ اطاعت کا ایک ہی مرتبہ جب بیان ہو رہا ہو تو "اطاعت کرو" "اطاعت کرو" کو دوبارہ کہنے کی تُک کونسی ہے؟

" اطاعت کرو، اللہ کی " کہنے کے بعد یہ کہا جاتا کہ " اطاعت کرو رسول کی " گواہ ہے اس بات پر کہ اولین مرتبۂ طاعت کا بیان ختم ہوا اور اس کے بعد دوسرے مرتبۂ طاعت کا بیان شروع ہوا اور اس طرح دونوں مراتب الگ الگ نمایاں ہو گئے۔ ایک امر کو دو ابواب میں تقسیم کیا گیا اور ہر باب کے لیے فعل کا استعمال بالکل الگ مستقل طور پر کیا گیا اور یہ اہتمام اس لیے ہے کہ محلِ گفتگو اسلام کے نظامِ اطاعت کی کڑیوں کو بیان کرنے کا تھا اور یہیں اگر فتنہ کے لیے راستے کھلے چھوڑ دئے جاتے تو دوسرے مقام پر تو پھر منشائے قرآنی کی بالکل ہی خیر نہ تھی! اس سے بڑا کندۂ ناتراش کون ہوگا جو یہ کہے کہ یہ ایک ہی مرتبۂ طاعت ہے جسے دو مختلف پیرایوں میں بیان کیا گیا ہے۔ پہلے سیدھے کان کو سیدھا ہاتھ سیدھے طریقے سے لگانا اور پھر سیدھے ہاتھ کو گردن کے گرد گھما کر سیدھے کان تک پہنچانا "مسٹرازم" کے ماڈرن ذہن کے لیے کوئی کارنامۂ فصاحت ہو تو ہو غریب قرآن کی ادبیت ان بلندیوں تک کہاں پہنچ سکتی ہے!

اسلامی نظام میں معیارِ فیصلہ یہ آیت ابھی ختم نہیں ہوئی، آگے چلتی ہے۔ ایک دینی اصول اور ایک دستوری دفعہ کی حیثیت میں مسلمانوں کو یہ بھی بتایا جاتا ہے کہ تمہاری فطرت میں داعیۂ اختلاف موجود ہے، اور اس فطری داعیہ کے لیے کام کرنے کا میدان اجتماعی نظام میں اسلام کی طرف سے رکھا جا رہا ہے، لہٰذا تمھیں جب اختلافات سے سابقہ پیش آئے گا تو اس وقت یہ سوال پیدا ہوگا کہ دین و سیاست کے روزمرہ کے معاملات میں وہ معیارِ فیصلہ کیا ہوگا جس کے ذریعے اختلافات رفع کئے جا سکیں۔ ہر نظامِ حیات میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے اور ہر نظامِ حیات اس کا جواب دیتا ہے۔ علم کے دائروں میں بھی ہر نظام کو ایک معیارِ فیصلہ دینا پڑتا ہے اور سیاست کے عملی میدان میں بھی! چنانچہ اجتماعی نظام کی ریڑھ کی ہڈی کو متعین کرنے والی اس دستوری آیت میں اسلام نے بھی اپنا معیارِ فیصلہ پیش کر دیا ہے۔ وہ یہ کہ :-

فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِیْ شَیْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ۔

پھر اگر ان تین مراتبِ اطاعت کے تحت زندگی کا نظم چلاتے ہوئے کسی معاملے میں تمہارے اندر نزاع واقع ہو تو اُس معاملے کو اللہ اور رسول کے سامنے لے جا کے رکھو!

یہاں پھر معیارِ فیصلہ کے طور پر صرف اللہ تعالیٰ کی ذات کو پیش نہیں کیا گیا۔ تنہا قرآن کی طرف رجوع کرنے کا اشارہ نہیں کیا گیا، بلکہ صراحتاً کہا گیا ہے کہ اختلافات کے تصفیہ کے لیے اپنے معاملات خدا اور رسولؐ کے سامنے رکھو۔ یعنی قرآن سے اصولیات معلوم کرو، اور رسولؐ کے اسوہ سے ان کی شرح و تعبیر اخذ کرو۔ یہاں پھر فتنہ گر ذہن یہ کہتا ہے کہ :-

-اللہ+ رسول = قرآن - یہی نہیں، بلکہ یہ لطائفِ قرآنی اس نتیجے تک پہنچاتے ہیں کہ اللہ اور رسول کی عملی جانشین تو ہوتی ہے اسلامی حکومت، اور اسلامی حکومت کا دل و دماغ اور اس کا مرکزِ اعصاب ہوتی ہے "اسلامی پارلیمنٹ" لہٰذا اللہ اور رسول سے مراد ہوئی پارلیمنٹ، اور امر یہ فرمایا جا رہا ہے کہ جن معاملات میں اختلاف ہو، انہیں تم لوگ اپنے اپنے وقت کی پارلیمنٹوں کے سامنے رکھ دیا کرنا، وہی تمہارے لیے اللہ اور رسول ہوں گی — یہ ہے قرآنی منطق جو ملاؤں کے بگاڑے ہوئے دین کو اپنی اصل حالت میں لانے کے لیے مصروفِ کار ہے۔ ان مجتہدینِ روزگار سے کوئی ہمیں یہ دریافت کرکے بتائے کہ اگر پارلیمنٹ آخری معیارِ فیصلہ ہو تو خود اس پارلیمنٹ کے اندر فکر و نظر کے جو اختلافات نمودار ہوں گے، مخالف و موافق جو دلائل سامنے آئیں گے، ان کے لیے معیارِ فیصلہ کیا چیز ہو گی؟ پارلیمنٹ کے خدا اور رسول کو بھی تو مشخص کر دیجیے۔ غالباً وہ صدر یا اسپیکر ہو گا، یا وزیرِ اعظم یا لیڈر آف دی ہاؤس؟ سبحان اللہ وبحمدہ!

قرآن پر بڑے بڑے ظلم ہوئے مگر یہ نوازشات آس پر کب کسی نے کی تھیں، اس کتابِ مظلوم کے ساتھ بڑے بڑے مذاق کیے گئے، مگر ایسا شاندار مذاق کسی کو کہاں سوجھا ہو گا۔

اللہ اور رسول سے اختلاف کرنے کا حق نہیں درحقیقت یہ معیارِ فیصلہ "مضمر تو آیت کے اسی پہلے حصے میں ہے جس میں اللہ کی اطاعت کو اصلاً مطلوب بنا کر، اور رسولؐ کی اطاعت کو اللہ تعالیٰ کے مستند نمائندہ و ترجمان ہونے کی بنا پر واجب قرار دے کر پیش کیا ہے۔ پھر اسی معیارِ فیصلہ کو نمایاں کرکے الگ بیان کر دیا، اور اس طرح بیان کر دیا کہ یہ حقیقت ازخود واضح ہو گئی کہ:

— نظامِ اسلامی میں فطری داعیۂ اختلاف کے کام کرنے کے لیے مناسب حد تک میدان کھلا ہے۔

— مسلمان باہم دگر اختلافات رکھ سکتے ہیں۔

— وہ اپنے اولی الامر یعنی حکام کی آراء، فیصلوں، پالیسیوں اور اقدامات کے بارے میں بھی اختلاف کا حق رکھتے ہیں۔

— ان اختلافات کو رفع کرنے کے لیے ان کے سامنے خدا کی کتاب اور رسول کی تعبیر و تبیین کو معیار رکھا گیا ہے۔

— خدا اور رسول جب معیارِ فیصلہ ہیں تو ان سے اختلاف کا حق کسی مسلمان کو نہیں۔

آیت کا معیارِ فیصلہ" کو سامنے لانے والا یہ حصہ ایک مضبوط شہادت ہے اس پر کہ خدا کی اطاعت مرتبہ اول پر اور رسولؐ کی اطاعت مرتبۂ دوم پر اپنی مستقل اور باہم دگر لازم و ملزوم ہیں کہ ان میں سے کسی کے دائرے میں بھی کسی مسلم کے لیے

چون و چرا اور اختلاف اور روگردانی کی گنجائش نہیں چھوڑی گئی۔ اس تفکر و تدبر سے یہ واضح ہوجاتا ہے کہ رسول اللہ کی اطاعت کا تقاضا اسلامی نظامِ اطاعت کے سلسلہ کے ایک اہم کڑی ہے اور اس کڑی کو نکال دیجیے تو پورا سلسلہ ٹوٹ جاتا ہے۔

۳۔ اولی الامر کی اطاعت آیت کا تیسرا مطالبہ یہ ہے کہ مسلم سوسائٹی میں اولی الامر کی اطاعت کی جانی چاہیے۔ لیکن ایسے گہرے اندازِ بلاغت کے ساتھ تیسرا مطالبہ آیت میں رکھا گیا ہے کہ اس کا مرتبۂ ثالث خوب اچھی طرح واضح ہوجاتا ہے "اطیعوا" کا استعمال اللہ تعالیٰ کے لیے کیا گیا، پھر اسی امر کو رسول اللہ صلعم کے لیے دوہرایا گیا، لیکن تیسری مرتبہ امر کو محذوف رکھ کر محض عطف سے کام لیا گیا۔ یہ اسلوب شہادت دیتا ہے کہ اصلاً طاعتیں دو ہی ہیں جن پر دین کا دار و مدار ہے یعنی خدا کی طاعت، اور رسول کی طاعت! اولی الامر کی طاعت مرتبۂ ثالث پر اس لیے لازم کی گئی کہ خدا اور رسول کا حکم اگر چل سکتا ہے اور اس حکم کے مطابق ایک اجتماعی ہیئت اگر تشکیل پا سکتی اور برقرار رہ سکتی ہے تو ایک نظامِ حکومت کے ذریعے ہی رہ سکتی ہے۔ اور حکومت چلانے کے لیے نہ خدا تعالیٰ کو خود آ کے کام کرنا ہے، نہ رسول اللہ صلعم ہی حیاتِ خضر لے کے آئے تھے، بلکہ خود اپنے دور میں بھی آنحضورؐ کے لیے یہ ممکن نہ تھا کہ حکومت کے تمام مناصب پر بیک وقت خود ہی متمکن ہو کر خلیفۃ اللہ کی حیثیت سے لے کر چپراسی اور سرکارے تک کے کام خود ہی کر ڈالیں۔ ناگزیر تھا کہ دستوری حیثیت سے اولی الامر کو اسلامی نظام کے سلسلۂ اطاعت کی ایک کڑی کی حیثیت دی جاتی، اور وہ دی گئی۔

مراتبِ اطاعت کی وہ ترتیب جو آیت میں سامنے آتی ہے پہلی دو طاعتوں کو اصل قرار دینے کی وجہ سے از خود یہ فیصلہ بھی کر دیتی ہے کہ اولی الامر کی اطاعت کا دائرہ وہاں ختم ہوجاتا ہے جہاں وہ خود اللہ اور رسول کی طاعت کی حدود سے تجاوز کریں۔ لفظ "منکم" مزید صراحت کرتا ہے کہ اولی الامر ہونے ہی وہ چاہئیں جو تم میں سے ہوں، یعنی اُسی اصول، اُسی ایمان، اُسی فکر، اور اسی نظامِ طاعت کے قائل ہوں جس کے تم ہو۔ پھر معیارِ فیصلہ کے طور پر خدا و رسول کو جب سامنے رکھ دیا تو اولی الامر پابند ہوگئے کہ اپنے ہر فیصلے اور اقدام میں خدا و رسول کی تعلیمات کے آگے سرِ تسلیم خم کریں۔

رسولؐ بہ حیثیت اولی الامر کے تین مراتبِ اطاعت کو دو میں بدلنے والا زرخیز ذہن جہاں اطاعتِ رسول کو اطاعتِ خدا میں گم کر کے مغالطے میں ڈالتا ہے، وہاں وہ دوسری تاویل کے ذریعے اطاعتِ رسول کو اطاعتِ کے ساتھ بھی جا ملاتا ہے بلکہ یوں کہیے کہ رسولؐ کو وہ پہلے دو حصوں میں بانٹتا ہے۔ ایک رسالت، دوسری امارت۔ پھر بہ حیثیت رسول تو وہ اس کو خدا کی طرف ملا دیتا ہے اور بہ حیثیت امیر وہ اسے وقت کے کارپردازانِ حکومت کے زمرے میں ڈال دیتا ہے

بہرحال سلسلۂ طاعت کی ایک کڑی اسے گم ضرور کرتی ہے، لیکن قرآن پڑھتے ہی یہ گمشدہ کڑی مل جاتی ہے۔ سوال یہ ہے کہ اگر اطیعوا اللہ کے ساتھ بقیہ دونوں طاعتوں کو ایک ہی مد میں ڈال کر واوِ عطف سے ملایا جائے اور مفہوم یہ ہو کہ چونکہ رسول کو یہاں بطور صاحبِ امامت کے لیا گیا ہے اس لیے "رسول" اور "اولی الامر" کی اطاعت سے مراد ایک ہی مرتبۂ اطاعت ہے، تو پھر اس مقام پر رسول کو رسول کہہ کر کیوں پیش کیا گیا اور الگ کیوں پیش کیا گیا۔ تنہا اولی الامر کے الفاظ پورا پورا کام دے سکتے تھے۔ رسولؐ تو اولی الامر کی صف میں از خود شمار ہو جاتا۔ اس کی وجہ بیان کی جانی چاہیے جب "رسول" کا لفظ ترجمان ہی رسول اللہ کی حیثیتِ رسالت کا ہے تو اس لفظ کو حیثیتِ امامت کے لیے کیوں استعمال کیا گیا؟ حیثیتِ امامت کے لیے اور کوئی لفظ نہیں رہا تھا؟ ایجاد نہیں ہو سکتا تھا؟ آپ کہہ سکتے ہیں کہ نہیں، اللہ تعالیٰ کی فصاحت و بلاغت کی شان ہی ایسی ہے کہ لفظ رسول کا بولتا ہے اور مراد لیتا ہے منصبِ امارت۔ اس پر ہم پوچھیں گے کہ اسی آیت میں دوبارہ جب معیارِ فیصلہ بیان کیا تو پھر اللہ اور رسول کے الفاظ استعمال کیے۔ اب یہاں یکایک وہی "رسول" کا لفظ بالکل دوسرے معنی دینے لگا؟ کیا مراتبِ طاعت والے ٹکڑے اور معیارِ فیصلہ والے اس ٹکڑے میں کوئی ربط نہیں کہ ایک کو سمجھنے کے لیے دوسرے سے فائدہ اٹھایا جائے؟ آخر قرآن کو قرآن سے سمجھنے کا مسلّمہ قاعدہ بھی یہاں بالائے طاق رکھ دیا جائے گا؟

آیت کی ساخت اصل صورت یوں ہے کہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت کو مطلوبِ حقیقی کی حیثیت سے بیان کر کے باقی کا سارا ٹکڑا بطور تفسیر دیا گیا ہے۔ یعنی دین و شریعت کا مرکزی تقاضا مسلمانوں سے یہی ہے کہ وہ اللہ کی ہدایت کے مطابق زندگی بسر کریں۔ لیکن اللہ تعالیٰ کی ہدایت پر زندگی گذارنے کا صحیح طریقہ یہی ہے کہ وہ رسول کی (فی المعروف) اطاعت کریں اور اس کے تحت کارپردازانِ حکومت کی اطاعت بھی کریں۔ رسول کی اطاعت اس لیے کہ خدا کی اطاعت کرنے کے لیے عملی صورت یہی ہے کہ اس کے انسانی نمائندہ و ترجمان کا دامن تھام کے چلا جائے۔ اور اولی الامر کی طاعت اس لیے کہ بغیر اس کے اجتماعی نظام نہیں چل سکتا ـــ اور یہاں معاملہ کسی صوفیانہ مذہبیت کا نہیں، ایک نظامِ تمدن و ریاست کا ہے۔ پھر یہ آیت اپنی تقسیمِ مطالب کے ذریعے یہ بھی واضح کر دیتی ہے کہ خدا وہ ہے کہ جس سے تم براہِ راست اپنا دین نہیں لے سکتے، تمہیں براہِ راست اگر واسطہ ہے تو ایک رسول سے ہے۔ دوسرے اولی الامر سے ہے۔

اولی الامر کو یہ آیت بالکل آخر میں جا ڈالتی ہے اور اوپر سے نیچے کی ترتیب کا تصور اگر پیش نظر رکھا جائے تو سب سے پہلے خدا تعالیٰ کا اقتدار سامنے آتا ہے، پھر رسول اللہ صلعم کا منصبِ نمائندگی و ترجمانی، پھر ان کے تحت اولی الامر کا منصبِ امر و انتظام۔ ان کڑیوں میں سے پہلی کو ہلا دیجیے تو دین ختم ہو جاتا ہے۔ دوسری کو ہٹا دیجیے تو دین کی عملی ہیئت تباہ ہو جاتی ہے۔ تیسری کو غت ربود کر دیجیے تو اجتماعی نظام کا محل گر جاتا ہے۔

اتنے مختصر الفاظ میں دنیا کا کوئی نظامِ فکر بھی اجتماعی زندگی کے لیے نظامِ طاعت کو پیش نہ کر سکا ہوگا کہ ساری کی ساری کڑیاں بھی واضح ہو جائیں اور ان کی ترتیب بھی ذہن میں آجائے اور ہر کڑی کی مقصدی اہمیت بھی نمایاں رہے۔

یہ آیت ٹھیک اس کلمۂ طیبہ کا ایک سیاسی و اجتماعی عکس پیش کرتی ہے جس کو قبول کرکے ایک آدمی مسلمان ہوتا ہے "لا الہ الا اللہ" کہتے ہی "اطیعوا اللہ" کا تقاضا پیدا ہو جاتا ہے، اور "محمد رسول اللہ" کے کلمات زبان پر لاتے ہی "اطیعوا الرسول" کا مطالبہ ابھر آتا ہے۔ اور جب بھی اجتماعی زندگی کو کلمۂ طیبہ کے مطابق استوار کرنے چلیے خود بخود "اولی الامر منکم" کی اطاعت کی ضرورت آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے۔

لازمۂ ایمان سورۂ نساء کی یہ معرکہ آرا آیت ایک سخت انتباہی جملہ بھی اپنے ساتھ رکھتی ہے۔ فرمایا "ان کنتم تؤمنون باللہ والیوم الاخر" یعنی تم لوگ اگر خدا اور آخرت پر ایمان رکھتے ہو تو تم کو خدا کی، رسول کی اور اولی الامر کی اطاعت کرنی ہوگی، اور اس سلسلۂ طاعت میں خدا و رسول کی تعلیم و توضیح کو معیارِ فیصلہ ماننا ہوگا۔ اس میں اشارہ مضمر ہے کہ جو کوئی اس سلسلۂ طاعت کو قبول نہ کرے اس کا خدا اور یومِ آخر پر ایمان رکھنے کا دعویٰ کھوکھلا دعویٰ ہوگا۔ پس یہ نظامِ طاعت جوں کا توں قبول کرنا لازمۂ ایمان ہے، ان میں سے جو کڑی بھی کوئی توڑ دیتا ہے وہ ایمان گنوا بیٹھتا ہے۔

فہمِ حق کی صحیح راہ اس کے بعد یہ بھی فرمایا کہ "ذالک خیر و احسن تاویلا" یعنی احکامِ الٰہی کی تحقیق و توضیح کے لیے اور ان پر عمل پیرا ہونے اور ان پر ایک نظامِ زندگی چلانے کے لیے یہی سلسلۂ طاعت بہترین صورت پیش کرتا ہے۔ تاویلِ کتاب یا تاویلِ احکام یا تاویلِ آیات کا صحیح طریقہ اس آیت نے متعین کر دیا۔ وہ صحیح طریقہ یہ ہے کہ ہر معاملے میں پہلے خدا کے فرمان کو دیکھا جائے، پھر رسولؐ سے اس کی تشریح اور اس کے بارے میں عملی نمونہ لیا جائے اور اس کے بعد اولی الامر نے اجتہاد کے دائرے میں جو عملی صورت طے کی ہو اسے قبول کیا جائے۔ "احسنِ تاویل" کی یہ راہ

چھوڑ کر اگر کوئی دوسری راہ اختیار کر لی جائے، اور محض خدا کے احکام کو لے کر رسول کی تشریح اور نمونے کو اڑا دیا جائے، یا اولی الامر کے اجتہادی فیصلوں کو رد کر دیا جائے تو پھر ضلالت کے سوا اور کچھ ہاتھ نہیں آتا۔ قرآن کو سمجھنے اور سمجھانے کی بیہودہ کوشش باطل اور رائگاں ہے جس میں قرآن کو رسول سے الگ کر کے لیا گیا ہو اور جس میں اطاعتِ خدا کو اطاعتِ رسول سے مجرد کر لیا گیا ہو۔ اسی طرح جہاں کہیں اسلامی نظام کارفرما ہو وہاں خدا و رسول دونوں کو واجب الاطاعت ماننے کے بعد اگر اولی الامر کے اجتہادی فیصلوں سے منہ موڑ کر اپنے لیے ایک الگ عملی راستہ نکالنے کی کوئی شخص سعی کرے اور معاشرے کے اجتماعی اقدامات کا ساتھ دینے سے انکار کر دے تو اس کی قرآن فہمی اور اس کی تفسیر و تاویلِ قرآن دو کوڑی کی قدر و قیمت بھی نہیں رکھتی۔ رسول کو درکنار رکھ کر قرآن کے کتنے ہی معارف لکھ جائیے۔ کتنے ہی رسالے چھاپ ڈالیے، کتنی ہی درس و تدریس کی محفلیں جمائیے اور ملاؤں کے خلاف دل کا کتنا ہی بخار نکالیے، خود قرآن کی نگاہ میں یہ سب غبارِ پریشان ہے جو تھوڑی دیر ہوا کو مکدر کرے گا اور پھر خود بخود ہوا ہو جائے گا۔

مزید توضیحات سلسلۂ کلام کا یہ کارواں ابھی اور آگے چلتا ہے اور ابھی استدلال کے کچھ اور موتی ہیں جو وحیِ الٰہی نے بکھیرے ہیں۔ اس آیت کے معاً بعد ان لوگوں کا ذکر چھڑ جاتا ہے جن کا طرزِ عمل دین و سیاست کے اسلامی نظام میں موجبِ خلل ہو رہا تھا۔ یہ بظاہر غیر مسلم لوگ نہیں تھے بلکہ ان کی شان یہ تھی کہ "یَزْعُمُوْنَ اَنَّھُمْ اٰمَنُوْا بِمَآ اُنْزِلَ اِلَیْکَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِکَ" (نساء ۶۰) (یہ اپنی ہدایت پر ایمان رکھنے کے زعم کو دل میں لیے ہوئے تھے) لیکن دوسری طرف ان کی روش یہ تھی کہ "یُرِیْدُوْنَ اَنْ یَّتَحَاکَمُوْٓا اِلَی الطَّاغُوْتِ" (چاہتے تھے کہ اپنے معاملات طے کرائیں تو طاغوت سے کرائیں) وہ خدا ہی کے دین کے تحت رہ کر یہ چاہتے تھے کہ رسولؐ کے منت کش نہ ہوں بلکہ آپؐ سے بالا بالا جس شیطان سے چاہیں حکم اور فیصلہ حاصل کرتے رہیں۔ متنبہ کیا گیا کہ ایسے لوگ جو خدا کے احکام میں سے من مانے فیصلے نکلوانے کے لیے رسول سے کترا کر دوسروں کی طرف رجوع کرتے ہیں تو وہ ضلالِ بعید کی طرف جا رہے ہیں۔ یہ گویا ہماری امت کے اولین منکرینِ حدیث و سنت تھے۔

ان لوگوں کو دعوت دی جاتی تھی کہ "تَعَالَوْا اِلٰی مَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ وَاِلَی الرَّسُوْلِ" (آؤ اللہ کے اتارے ہوئے ضابطہ کی طرف، اور رسولؐ کی طرف) پکار صرف قرآن کی طرف نہیں، مطالبہ رسول کے آگے اپنے معاملات کو پیش کرنے کا ہے۔ دیکھیے یہاں وہی "اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول" بول رہا ہے اور اس کی گونج سنائی دے رہی ہے لیکن

ان کا حال یہ تھا کہ "یصدون عنک صدودا" یعنی ان کے دل آنحضورؐ کے سامنے معاملات رکھنے کے معاملے میں بالکل بھینچ کر رہ جاتے ہیں اور قدم جیسے رُک جاتے ہیں۔ خدا کے حکم سے فرار کرنے کا کوئی الزام نہیں دیا جا رہا، صرف رسول اللہ کی اتھارٹی تسلیم کرنے سے گریز کو واضح کیا جا رہا ہے، اور یہی چیز ہے جس پر اُن کو نفاق کا مجرم قرار دے دیا گیا ہے۔

اور پھر — ان کا نفسیاتی تجزیہ کرنے کے بعد اُن کو آگاہ کیا جاتا ہے کہ:

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ

اور، ہم نے جو بھی رسول بھیجا ہے، اسی صورت کے ساتھ (اتھارٹی دے کر) بھیجا ہے کہ اللہ کے اذن کے تحت اس کی اطاعت کی جائے۔

ذرا ملاحظہ فرمائیے، اس تحدی کو، اس حصر کو، اس زورِ کلام کو، اس جامعیت کو، اس قطعیت کو، اور لہجہ کی اس تندی کو جس سے یہ فرمان صادر ہو رہا ہے۔ معلوم ہوا کہ اوپر سے ساری بحث رسول کی اطاعت نہ کرنے پر ہی چل رہی تھی اور اس کو صاف کرنے کے لیے فیصلہ کن انداز میں بات ختم کی جا رہی ہے کہ ہم تو رسول بنا کر بھیجتے ہی ہمیشہ اس اتھارٹی کے ساتھ ہیں کہ لوگوں کو ان کی اطاعت کرنی ہوگی! اس سے کوئی استثنیٰ نہیں! صرف قرآن کو ماننے اور صرف خدا کی اطاعت من مانے طریق پر کرنے سے کام نہ چلے گا۔

ہمارے جدت طراز مفسرین کہیں گے کہ جی ہاں! رسولؐ کی اطاعت فی الواقع ضروری ہے لیکن صرف رسول ہونے کی حیثیت کی حد تک، اور اس حیثیت میں رسول کے تقاضے ٹھیک وہی کچھ ہیں جو کچھ قرآن کے ہیں، پس قرآن کی اطاعت مطلوب ہے۔ یہ باتیں جدت کے لطائف کے لحاظ سے دلچسپ سہی، سوال تو یہ ہے کہ اوپر سے جو جھگڑا چلا آ رہا ہے اس کے پیش نظر ان الفاظ کا مدعا معلوم کیجیے۔ اوپر تو منافقین کی اس روش پر گرفت کی جا رہی ہے کہ وہ ظاہر خدا اور اس کی کتاب سے انکار کئے بغیر رسول اللہ کے سامنے معاملات پیش کرنے سے اپنے آپ کو بالاتر رکھنا چاہتے تھے — اور اس موقع پر آپ ضرور فرمائیں گے کہ یہاں رسول کا منصبِ قضا مراد ہے جو اسلامی ریاست کا ایک شعبہ ہونے کی حیثیت سے واجب الاحترام تھا — لیکن منصبِ قضا پر بات ہوتے ہوتے یہاں کیسے آپہنچی کہ اللہ تعالیٰ نے ایک اصولی حقیقت انبیاء و رسل کے منصب کے بارے میں بیان کی کہ ہم رسول یونہی نہیں

بھیج دیتے کہ ان سے جو جیسا معاملہ چاہے رکھے، بلکہ ہم انھیں ہمیشہ "مُطاع" بنا کے بھیجتے ہیں۔ یا تو دونوں جگہ منصبِ قضا کو سامنے رکھیے یا دونوں مقامات پر منصبِ رسالت و نبوت کو! اور پھر بتائیے کہ کیا مفہوم ہاتھ آیا؟

مگر قرآن آپ کو یوں چھوڑتا کہاں ہے، یہ تو اہلِ زیغ کو بڑے گھر تک پہنچا کے رکتا ہے۔ آگے سنیئے۔ ان منافقین کے بارے میں فرمایا کہ اگر یہ اپنی جانوں پر ظلم ڈھانے والے، ظلم ڈھانے ہی فوراً آپؐ کے پاس حاضر ہوتے اور ــــ فاستغفروا اللہ واستغفر لھم الرسول لوجدوا اللہ توابا رحیما (آیت ۶۴) یہ ان کو راہِ اصلاح بتائی، ان کو توبہ کا طریقہ بتایا۔ کیا؟ یہ کہ وہ اللہ تعالےٰ سے معافی طلب کریں، اور رسولؐ ان کے لیے اللہ تعالیٰ سے معافی کی درخواست کرے۔ دیکھیے وہی ترتیب یعنی اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول کے ایک جزء سے انحراف ان کا وہ گناہِ عظیم ہے جس کے بخشوانے کے لیے ان کو رسول اللہ کی خدمت میں پشیمانی کے ساتھ حاضر ہونا چاہیے، پھر خود خدا سے توبہ کرنی چاہیئے اور دوسری طرف رسولؐ کو راضی کرنا چاہیے تاکہ وہ بھی اللہ تعالےٰ کے سامنے ان کی معافی کے لیے دعا کرے! اب فرمائیے کہ اگر بندوں کا معاملہ رسولؐ سے سروکار رکھے بغیر خدا سے براہِ راست ہوتا اور ان کو اپنا دین اپنے خدا سے لے کر اپنا مسلک خود بنانا ہوتا اور اُس دین سے فیصلہ از خود اخذ کرنا ہوتا تو وہ جب بھی مجرم ہوتے تو خدا ہی کے مجرم ہوتے اور خدا ہی سے مغفرت طلب کرنے پر معاملہ بس کرتا لیکن قرآن بتاتا ہے کہ جب وہ رسول کی نافرمانی کرتے ہیں یا اس کی اتھارٹی کو نظر انداز کرتے ہیں تو خدا اور رسول دونوں کے سامنے مجرم ٹھہرتے ہیں اور لازم ہوجاتا ہے کہ دونوں سے معاملات کو صاف کریں! دیکھیے یہاں بھی اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول کی صدائے بازگشت سنائی دے رہی ہے!

رسولؐ آخری حکم ہے | مضمون کی اہمیت ایسی ہے کہ مغالطوں کا ایک ایک کانٹا چن کر نکال دینے کے لیے گفتگو اور آگے چلتی ہے۔ شکوک کو اور صاف کیا جاتا ہے، شبہات کا مزید ازالہ کرنا ملحوظ ہے۔ فتنہ کے دروازے بند کرنے کا اور بھی شدید اہتمام کیا جاتا ہے۔ اب ہم ایک ایسی آیت پر پہنچتے ہیں جو مذکورہ بالا آیت کی طرح رسول اللہؐ کی اتھارٹی کو متعین کرنے میں عدد درجہ واضح اور اہم ہے۔ ملاحظہ ہو:

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتَّىٰ يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ (النساء - ۶۵)	سو (اے رسولِ خدا) تیرے آقا کی قسم کہ یہ لوگ ایمان کی دولت سے اس وقت تک مالامال نہیں ہوسکتے جب تک

تجھے اپنے معاملات میں حکم نہ بنا لیں۔

وہی معیارِ فیصلہ" جس کا اوپر بیان ہو چکا ہے، اسی کے ایک پہلو کو یہ آیت اور زور سے ابھار کر سامنے رکھ دیتی ہے معیارِ فیصلہ خدا اور رسول ہیں، لیکن چونکہ جس گروہ کے فسادِ ذہن پر بحث ہو رہی ہے وہ خدا کی اتھارٹی ماننے میں کوئی اختلاف نہیں رکھتا تھا، اس لیے متفق علیہ پہلو کو بحث میں ساقط کر کے رسول کی اتھارٹی کے اس پہلو پر پورا زور دیا گیا جس میں اختلاف تھا۔ وہ لوگ "قرآن" کو لیتے تھے اور "رسول" کو درکنار رکھنا چاہتے تھے۔ وہ رسولؐ سے لگا ڈکر خدا سے براہِ راست یاری گانٹھنا چاہتے تھے۔ وہ تاج کے نمائندہ و ترجمان سے سرکشی کر کے سلطانِ حقیقی کی آنکھوں میں وقار حاصل کرنا چاہتے تھے۔ ان کو متنبہ کیا جا رہا ہے کہ تم رسولؐ سے انقطاع کر کے بالا بالا خدا سے واسطہ قائم رکھنے کی جو الٹی چال چل رہے ہو اس طرح تم ایمان سے بہرہ ور نہیں ہو سکتے۔ رسولؐ کو حَکَم اور معیارِ فیصلہ نہیں مانو گے تو تمہارا قرآن کو ماننا بھی اللہ کے ہاں معتبر نہیں ہے اور وہ تمہیں اہلِ ایمان کے دائرہ سے خارج کر کے کفار کی فہرست میں شامل کرے گا۔

اس مقام پر ایک تو لفظ یُحَکِّمُوْکَ قابلِ غور ہے۔ حَکَمَ یَحْکُمُ حُکْمًا (بالامر وللرجل او علیہ وبینہم) کے معنی ہیں قضیٰ و فصل، یعنی معاملے کو چکایا اور مختلف فیہ امر میں فیصلہ دیا، اُس کا حق اُس کے لیے متعین کر دیا اور اس کا حق اِس کے لیے! ایک فریق کی ذمہ داری اور دوسرے فریق کی ذمہ داری کو فیصلے کی لکیر کھینچ کر الگ الگ کر دیا۔ فیصلہ دینے میں وہ قوت و اختیار شامل ہے جس کے تحت اس کو منا جائے۔ اسی لیے اس مادے سے اَحکَمَہٗ، جب کہیں گے تو مراد یہ ہوگی کہ اُس نے اُسے کسی طرف سے لوٹایا اور لوٹ گیا، اسے باز رکھا اور وہ باز آگیا۔ اَحْکَمَ الفرس کہیں گے تو مطلب ہوگا کہ وضع علیہا حَکَمَۃً، یعنی اس کی باچھوں کے اندر لگام کی رسی ڈالی۔ "اَحْکَمَہٗ عن" کہئے تو مدعا یہ ہوگا کہ اسے فلاں چیز سے روک دیا اور پھیر دیا۔ پھر اس مادے سے آتا ہے حَکَّمَہٗ جو معنی دیتا ہے، وَلَّاہُ وَ اَقَامَہٗ حَاکِمًا یعنی اسے اختیارات سونپے یا حاکم بنایا، حَکَّمَہٗ فی الامر کے معنی ہوں گے، فَوَّضَ اِلَیْہِ الحُکْمَ فِیْہِ، یعنی کسی معاملے میں فیصلہ دینے کا اختیار اس کے حوالے کر دیا حَکَّمَہٗ عَنْ کَذَا کا ترجمہ ہوگا: ارجعہٗ و منعہٗ، یعنی اسے کسی چیز سے ہٹایا اور باز رکھا۔" الحَکَم" کہتے ہیں مُنفِذُ الحُکم کو یعنی وہ شخص یا ادارہ جس کی اتھارٹی سے فیصلہ صادر اور نافذ ہو۔

اس مختصر لغوی وضاحت سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ حَکَمَ یَحْکُمُ کا مادہ ایک اتھارٹی کی طرف اشارہ کرتا ہے وہ اتھارٹی ایسی ہے کہ جس کا حامل مختلف فیہ امر میں فریقین کو فیصلہ دیتا ہے، وہ حق اور باطل، جائز اور ناجائز کو تقسیم کر دیتا ہے۔ وہ دونوں کے حقوق اور دونوں کی ذمہ داریوں میں خطِ فاصل کھینچتا ہے۔ وہ ہر فریق کو کسی چیز سے ہٹانے پھیرنے اور باز رکھنے کا سزاوار ہے۔ حَکَمَ یَحْکُمُ کا مطلب یہ ہوا کہ کسی کے لیے اس اتھارٹی کو اپنی رضا سے تسلیم کر کے اپنے معاملاتِ نزاعی کو اس کے سامنے رکھنا اس میں یہ بات از خود شامل ہے کہ سرتابی کا حق اپنے لیے ختم کر لیا گیا ہو۔

یہ پوزیشن ہے جو قرآن نے رسول اللہ صلعم کو نظامِ دین میں عطا کی ہے۔ یعنی آپ کو اللہ تعالیٰ نے تو لوگوں کے معاملات میں حُکم ٹھہرایا ہی ہے، لیکن مطلوب یہ ہے کہ مسلمان بہ طوع و رغبت آنحضورؐ کی اس اتھارٹی کو تسلیم کریں۔ محض سیاسی دباؤ سے یہ حیثیت تسلیم کر کے چار و ناچار آپؐ سے فیصلے لینا اور بادلِ ناخواستہ ان کو ماننا ایمان سے بہرہ ور نہیں کر سکتا۔ یہ صورت تو صرف آدمی کو اسلام کے سیاسی نظام میں ظاہری حیثیت سے مسلم کا درجہ دلوا سکتی ہے، لیکن دینی حیثیت سے عند اللہ آدمی کا مومن ہونا تقاضا کرتا ہے کہ آنحضورؐ کو طوع و رغبت سے فیصلہ کن اتھارٹی مانا جائے۔ (باقی)

فاطمین مصر (زیر طبع)

سلاجقہ

المعتصم (زیر طبع)

از، سید ابو الاعلیٰ مودودیؒ

دولتِ عباسیہ کے سیاسی زوال کے بعد جس سلطنت نے ممالک اسلامیہ کے بیشتر حصہ کو ایک مرکز پر جمع کیا اور مسلمانوں کو سیاسی انتشار اور پراگندگی سے نکال کر دنیا کے سامنے عالمِ انسانی کا رہنما اور امام بن کر آخری مرتبہ پیش کیا وہ سلجوقی سلطنت تھی اس کے کارنامے مولانا کی اس تاریخی کتاب میں ملاحظہ کیجیے۔ قیمت : ۳/۸

سول ایجنٹ : طاہر رسول قادری، ۸۱ پیر غازی روڈ اچھرہ • مرکزی مکتبہ جماعتِ اسلامی پاکستان اور اپنے شہر کے کتب فروشوں سے طلب فرمائیں۔

عقیدۂ ختم نبوت کے چند عمرانی پہلو

(از: عبدالحمید)

[اس مضمون کی پہلی قسط نومبر ۱۹۵۴ء کے ترجمان میں شائع ہو چکی ہے۔]

علمأ اسلام نے صرف کائنات اور اس کے خارجی مظاہر کو ہی جاننے کی کوشش نہیں کی بلکہ دین کے محکمات کے نیچے فلسفہ عمومی کی جو ایک جوئے حیات رواں دواں ہے، اس میں غوطہ لگا کر تازگی اور زندگی کا راز دریافت کیا اور پھر اس سے نوع انسانی کو آشنا کیا۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے زندگی کے جس جس گوشے سے متعلق تفصیلی ہدایات پیش فرمائی تھیں، ان سے جزئیات مرتب کیں، اور پھر ان کی راہنمائی میں ان مسائل کو حل کیا --- جن کو تاریخ کی اضطراری چال نے جنم دیا تھا۔ مسلم قوم کی اس کاوش اور تلاش و جستجو کو اسلامی اصطلاح میں "اجتہاد" کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ ملت اسلامیہ میں اسے ایک خاص مقام اور اہمیت حاصل ہے۔ یہ فرض سب سے پہلے رسول اللہؐ کے رفقأ کار نے سرانجام دیا، ان کے بعد اس فرض کی ادائیگی میں بے شمار علمأ امت نے اپنی کاوشیں وقف کیں۔ امام ابوحنیفہ، امام مالکؒ، امام شافعی اور امام احمد بن حنبل، قاضی ابی یوسف، غزالی، خطابی، عزالدین ابن عبدالسلام، اشعری، ابن تیمیہ، ابن قیم اور شاہ ولی اللہ ایسے جلیل القدر علمائے اسلام سب اسی ایک کام کی وجہ سے تاریخ اسلام میں ممتاز نظر آتے ہیں۔

اس سے کہیں یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم سے پیشتر جتنے انبیاء گزرے ہیں ان کے ماننے والوں نے دینی مصالح کو سمجھ کر ان سے تفصیلات اخذ نہیں کیں۔ ان میں یقیناً بہت سے ایسے علماء نظر آتے ہیں جنہوں نے انبیاء علیہم السلام کی تعلیمات سے جزوی احکامات مستنبط کئے۔ مگر ان میں اور علمأ اسلام میں ایک بنیادی اور اساسی فرق نظر آتا ہے اور اس فرق کو ہر وہ شخص جان سکتا ہے جس نے مختلف مذاہب کی تاریخ کا ایک محققانہ اور گہری نظر سے جائزہ لیا ہے۔

اُن کی تحقیقات پر اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ انھوں نے ہر زمانے کے نئے نئے تقاضوں اور نئے نئے مسئلوں کے متعلق دو مختلف اور متضاد طریقے اختیار کئے ہیں۔ ایک گروہ نے معاشرہ کے ارتقا کا سرے سے انکار کر کے بغیر کسی فکری کاوش کے انبیاء علیہم السلام کے احکامات کو اندھا دھند نافذ کرنا شروع کیا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تاریخ انسانی نے جب کوئی ورق الٹا تو اس میں خدا کے ان "پاکباز" بندوں کی تعلیمات بھی گم ہو کر رہ گئیں۔ اس کے برعکس دوسرے گروہ نے بجائے اصل تعلیمات کے مضمرات کے ڈھونڈ کر ان کو وقت کی مناسب جزئیات پر اطلاق کرنے کے خود اپنی من گھڑت باتوں کو دین کی حیثیت سے پیش کرنا شروع کیا۔ ہوا و ہوس کے غلام انسانوں کو جب "مقامِ کبریائی" پر فائز ہونے کا زعم ہونے لگا تو وہ اپنا دماغی توازن قائم نہ رکھ سکے اور انھوں نے رشد و ہدایت کے اصل ماخذ کی طرف رجوع کرنے کی بجائے خود اپنے نفس سے ایسی ایسی چیزیں وضع کرنا شروع کیں جن کی اصل دین میں معمولی سے معمولی گنجائش بھی نہ تھی۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ لوگوں کی نظر میں اصل دین بے وقعت ہو کر رہ گیا۔ اور عقیدت کا مرکز ان کی اپنی شخصیتیں اور خیالات بن گئے۔ زمانہ نے جس قدر ترقی کی عوام اسی نسبت سے اپنے اصل مرکز سے ہٹتے چلے گئے۔ اور ایک وقت ایسا آیا جس میں کبھی اس امر کی ضرورت بھی محسوس نہ ہوئی کہ ان حضرات سے ان کے پیش کردہ افکار و خیالات کی سند بھی پوچھ لی جائے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں قرآن حکیم ان کی اس غلطی کو واضح کرتے ہوئے کہتا ہے:

قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَاۗءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْـًٔا وَّلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ (سورۂ آل عمران)

کہو اے اہل کتاب! آؤ ایک ایسی بات کی طرف جو ہمارے اور تمہارے درمیان یکساں ہے۔ یہ کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی بندگی نہ کریں۔ اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں اور ہم میں سے کوئی اللہ کے سوا کسی کو اپنا رب نہ بنائے۔

ان آیات سے یہ بات بالکل ظاہر ہے کہ اسلام کی تعلیمات کے مطابق کسی کو مطاعِ مطلق مان لینا ہی اس کو رب قرار دینے کے مترادف ہے۔ اور یہ مقام صرف خدا کے لیے ہی مخصوص ہے۔ رسولؐ کی بھی بلا چون و چرا پیروی صرف اس لیے کی جاتی ہے کہ خداوند تعالیٰ اسے خود اپنے احکامات کا پیامبر بناتا ہے، اور اس کے افکار و اعمال کے ذریعہ وہ نوعِ انسانی پر اپنا منشا واضح کرتا ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ کے ان "فرستادوں" کے علاوہ

دنیا میں کوئی شخص ایسا نہیں جو منزہ عن الخطا ہونے کا دعویٰ کر سکے، اور نوع انسانی سے یہ مطالبہ کرے کہ تم اس کے ہر قول و فعل کو بغیر کسی سند کے قبول کر لو۔

عیسائیت میں اس کے برعکس دیکھیے، کہ وہاں پوپ کی عصمت کیتھولک مسیحیوں اور پادریوں کے اجماع یعنی کلیسا (CHURCH) کی عصمت کل مسیحیوں کا متفقہ عقیدہ رہا ہے:

"ایک مخصوص کلیسا کے بغیر نجات ممکن نہیں۔ اس پر ہمیشہ روح القدس کا سایہ رہتا ہے۔ اس لیے مسائل میں کلیسا سے امکان خطا ہے ہی نہیں۔"[۱]

مسلمانوں اور دوسرے مذاہب کے پیروؤں کے درمیان اس ضمن میں جو اختلاف پایا جاتا ہے اس نے ان کے خیالات و افکار کے علاوہ ان کی معاشرتی زندگی کو بھی متاثر کیا ہے:

عامۃ المسلمین کے سامنے جب کوئی نیا نظریہ، یا خیال پیش کیا گیا، تو انھوں نے سب سے پہلے یہ دیکھنا چاہا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات سے کس قدر اقرب ہے، انھوں نے اس کا مزاج جتنا اس کے قریب پایا، اسی نسبت سے اسے جلدی قبول کیا اور جہاں یہ دیکھا کہ اس کا تعلق اپنے ماخذ سے کم ہے، وہاں اسے ماننے سے نہ صرف انکار کیا بلکہ پوری قوت سے دبانے کی بھی کوشش کی۔

یہی نہیں بلکہ خود ان بزرگان دین نے دوسرے مذاہب کے علماء کے برعکس بالکل ایک دوسری پوزیشن اختیار کی۔ انھوں نے لوگوں سے یہ کہنے کی بجائے کہ تم ہمارے اقوال کو بالکل بے خطا اور تنقید سے بالاتر سمجھو۔ ان سے اس امر کا تقاضا کیا کہ ان کی کسی رائے کو ماننے سے پیشتر اسے کتاب و سنت کی کسوٹی پر اچھی طرح پرکھ کر دیکھ لو۔ اور اگر وہ ان کے قریب ہو تو مان لو، ورنہ رد کر دو۔ چنانچہ امام مالکؒ فرماتے ہیں:

ما من احد الا هو ماخوذ من كلامه ومردود عليه الا رسول الله	رسول اللہ کے سوا ہر شخص کے کلام میں قابل اخذ اور قابل ترک باتیں ہیں۔

اسی طرح امام ابوحنیفہؒ نے بھی فرمایا:

لا ينبغي لمن لم يعرف دليلي ان يفتي بكلامي	جو شخص یہ نہ معلوم کر سکے کہ ایک بات میں نے کتاب و سنت کی کس دلیل کی بنا پر کہی وہ میرے قول پر فتویٰ نہ دے۔

[۱] ENCYCLOPEDIA BRITANNACA VOL 16. P 940

قاضی ابو یوسف، فقہ حنفی کے ایک دوسرے بزرگ نے بھی یہی ارشاد فرمایا:

لا یحل لاحد ان یفتی بقولنا ما لم یعلم من این قلنا

یہ بات کسی کے لیے جائز نہیں ہے کہ وہ ہمارے قول پر فتویٰ دے جب تک اُسے یہ نہ معلوم ہو کہ وہ بات ہم نے کہاں سے کہی ہے۔

عصام بن یوسف سے پوچھا گیا کہ اس کا کیا سبب ہے کہ آپ بہت سی باتوں میں امام ابوحنیفہؒ صاحب سے بھی اختلاف کر جایا کرتے ہیں۔ انھوں نے اس کے جواب میں جو کچھ ارشاد فرمایا وہ اسلام میں اجتہاد کی روح کو سمجھنے کے لیے بہت اہمیت رکھتا ہے۔ کہنے لگے "اللہ تعالیٰ نے امام صاحب کو فہم و فراست میں سے وہ حصہ عطا فرمایا ہے جو ہم کو نصیب نہیں ہوا۔ اس لیے وہ ایسی باتوں تک پہنچ جاتے ہیں جن تک ہم نہیں پہنچ پاتے۔ اور یہ ہمارے لیے ممکن نہیں ہے کہ ہم ان کے کسی قول پر بلا سمجھے بوجھے فتویٰ دے دیں۔

امام شافعیؒ نے بھی اس امر کی تاکید فرمائی ہے:

مہما قلت من قول او اصلت من اصل فبلغ عن رسول اللہ خلاف ما قلت فالقول ما قالہ صلی اللہ علیہ وسلم

میں جو بات بھی کہوں اور جو اصول بھی ٹھہراؤں جب اس کے خلاف کوئی بات رسول اللہ سے مل جائے تو پھر حضورؐ کی بات اصل ہے۔

امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ نے اسی سلسلہ میں یہ قطعی فیصلہ صادر فرما دیا:

لیس لاحد مع اللہ رسولہ کلام

اللہ اور رسول کی بات کے ہوتے ہوئے کسی بات کے لیے کوئی گنجائش نہیں ہے۔

پھر چونکہ یہ حضرات حق کو اپنے ہی اقوال کے اندر محدود نہ سمجھتے تھے۔ اس لیے ان کے قلوب میں وسعت نگاہوں میں بلندی اور علم میں کشادگی پیدا ہوئی۔ انھوں نے اپنے طرز عمل میں زیادہ سے زیادہ رواداری پیدا کی اور اپنی فطرت کو زیادہ سے زیادہ آفاقی اور مزاج کو حقیقت پسند بنایا۔ انھوں نے ملت اسلامیہ کا دائرہ ممکن حد تک وسیع کیا تاکہ اس میں زیادہ سے زیادہ افراد سما سکیں۔ مسلم قوم کی اسی خوبی کا ذکر کرتے ہوئے ڈاکٹر اقبال نے

اپنی کتاب "اسلام اور احمدیت" میں لکھا ہے:

"یہ سچ ہے کہ مسلمانوں کے مذہبی فرقے فقہ اور دینیات (THEOLOGY) میں اختلاف کی وجہ سے اکثر و بیشتر ایک دوسرے پر الحاد کا الزام لگاتے رہتے ہیں۔ دینیات کے فروعی مسائل کے اختلاف میں اور نیز الحاد کی ایسی انتہائی صورتوں میں جہاں ملحد کو جماعت سے خارج کیا جاتا ہے۔ لفظ کفر کے غیر محتاط استعمال کو آج کل کے تعلیم یافتہ مسلمان، جو مسلمانوں کے دینیاتی مناقشات کی تاریخ سے بالکل ناواقف ہیں ملت اسلامیہ کے اجتماعی و سیاسی انتشار کی علامت تصور کرتے ہیں۔ یہ ایک بالکل غلط تصور ہے۔ اسلامی دینیات کی تاریخ سے ظاہر ہوتا ہے کہ فروعی مسائل کے اختلاف میں ایک دوسرے پر الحاد کا الزام لگانا باعث انتشار ہونے کی بجائے دینیاتی تفکر کو متحد کرنے کا ذریعہ بن گیا۔ پروفیسر سرگرانج (HURGRONJE) کہتے ہیں کہ جب ہم فقہ اسلامی کے نشوونما کی تاریخ کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوجاتا ہے کہ ایک طرف تو ہر زمانے کے علماء خفیف سے اشتعال کے باعث ایک دوسرے کی مذمت یہاں تک کرتے ہیں کہ ایک دوسرے پر کفر کا الزام عائد ہوجاتا ہے اور دوسری طرف یہی لوگ زیادہ سے زیادہ اتحاد عمل کے ساتھ اپنے پیشروؤں کے اختلاف رفع کرتے ہیں۔"

جو کچھ اوپر عرض کیا گیا ہے اس پر ایک گہری نگاہ ڈالیے اور پھر اس امر کا اندازہ لیجیے کہ مسلمانوں کا یہ طرز عمل اسلام کے کس بنیادی فکر کا نتیجہ ہے۔ آپ اس معاملہ پر کسی قدر بھی غور کریں گے تو یہی پائیں گے کہ ملت اسلامیہ کا یہ ذہنی ارتقاء صرف ختم نبوت کی وجہ سے ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر چونکہ وحی کا سلسلہ بالکل منقطع ہوگیا، اس لیے مسلمانوں نے خدا کے منشا کو حضور کی تعلیم سے اخذ کرنے کی کوشش کی۔ حد تو یہ ہے کہ جہاں جہاں مسلمانوں نے ایک دوسرے سے اختلاف بھی کیا وہاں بھی دلیل صرف یہی پیش کی گئی کہ اس معاملہ میں "میرے سرکار نے یوں حکم دیا ہے"۔ یہی ایک مرکز ثقل ہے جس کی طرف امت مسلمہ کا ہر ہر فرد خواہ اس کا تعلق کسی طبقے یا زمانے سے ہو جھکتا رہا اور جب تک وہ دنیا میں موجود ہے جھکتا رہے گا۔ اس کی متجسسانہ نگاہیں ہمیشہ افکار و خیالات، نظریات اور تصورات کے سنگریزوں میں اُن ہیروں کی متلاشی رہیں جن میں انہیں نبوت محمدی کی جوت نظر آسکے۔

یہ طرزِ عمل اپنے نتائج کے اعتبار سے تاریخ انسانی میں بڑی اہمیت کا حامل رہا ہے۔

کائنات اسباب و اثرات کا ایک وسیع اور پیچیدہ طلسم ہے جو غیر محدود زمان و مکان میں پھیلا ہوا ہے۔ اور طبیعی قوانین کا پابند ہے۔ انہیں قوانین کی تلاش و جستجو کائنات کے مختلف گوشوں میں وحدت پیدا کرتی ہے۔ انسان نے جس رفتار سے انہیں دریافت کیا۔ اسی سرعت کے ساتھ زمان و مکان کے اسرار و رموز اس پر کھلتے چلے گئے اور بالآخر اس نے ان دونوں کو مسخر کر کے پوری کائنات کو ایک وحدت کی حیثیت سے استعمال کرنا شروع کیا۔

آج سے چند سال پیشتر اس وحدت کی آخری شکل جو ممکن تصور کی جا سکتی تھی وہ صرف یہ تھی کہ ایک ہی زمانے میں ملک، رنگ، نسل کے اختلافات کو یکسر ختم کر کے پوری دنیا کو ایک اکائی اور پوری نوع انسانی کو ایک وحدت بنا دیا جائے مگر عصر حاضر نے اپنی نت نئی ایجادات اور اختراعات سے انسانیت کو وحدت کے وسیع تر مفہوم سے آشنا کیا ہے۔ چنانچہ اس نئی وحدت کے لیے نہ صرف مکان کی تسخیر ضروری معلوم ہوئی بلکہ زمانے کا حجاب ختم کر دینا بھی لازمی سمجھا گیا۔ اس نئے نظریہ کے مطابق زمان منفرد آنات کا ایک تواتر ہے اور اس لحاظ سے اس کائنات کے سارے واقعات و حادثات ایک متحرک جلوس کی شکل میں ظاہر ہو رہے ہیں۔

تسخیر زمان و مکان کا یہ عمل صرف آب و گل کی دنیا میں جاری نہیں بلکہ اس کا سلسلہ قوانین اخلاق میں بھی موجود ہے۔ البتہ ان دونوں میں ایک بنیادی فرق یہ پایا جاتا ہے کہ نظام تکوینی کے قوانین انسان اپنی کاوش و محنت سے دریافت کرتا ہے مگر اس کے برعکس انسانی ہدایت کا ضابطہ باری تعالیٰ خود اپنی مرضی کے مطابق اپنے انبیا کے ذریعہ انسانوں پر نازل فرماتے ہیں۔ ان دونوں میں جو چیز قدر مشترک کی حیثیت رکھتی ہے وہ یہ ہے کہ دونوں نے انسانیت کے راستے سے زمان و مکان کی رکاوٹوں کو ختم کر کے اسے ایک وحدت بنانے کا عزم کیا جو کام عالم طبیعات میں قوانین طبیعی کی دریافت سے سرانجام پایا، وہی کام عالم اخلاق میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر سلسلہ نبوت ختم ہونے کی وجہ سے پایہ تکمیل کو پہنچا۔ حضور سرور دو عالم نے جس طرح انسان کے گرد طینت کی دیواروں کو گرا کر اسے ایک دوسرے سے بالکل قریب کر دیا، اسی طرح حضور نے اس قوم کو عقیدہ ختم نبوت عطا فرما کر ماضی و حال کے تفرقہ کو بھی یکسر مٹا ڈالا۔ حضور کے دوسرے احسانات کی طرح

انسانیت پر یہ بھی ایک عظیم احسان ہے کہ انھوں نے قانون شرعی کو اپنی آخری شکل میں پیش فرما کر اخلاقی اعتبار سے ازل و ابد کی طنابیں کھینچ دیں اور انسان پر اس راز کو آشکارا کیا کہ جس طرح قانون طبیعی کے مطابق یہ کائنات ایک وحدت ہے۔ اسی طرح قانون اخلاق کی رُو سے بھی یہ ایک ہی ہے۔ ہمیں امروز و فردا کے درمیان جو حجابات نظر آتے ہیں وہ محض ہماری نظر کا دھوکہ ہیں ؎

زمانہ ایک، حیات ایک، کائنات بھی ایک دلیل کم نظری قصۂ جدید و قدیم (اقبال)

دنیا کی تاریخ پر ایک نگاہ ڈالیے تو معلوم ہوگا کہ قدیم اقوام اور مذاہب میں اس قسم کے تصورات عام طور پر پائے جاتے ہیں کہ فلاں شخص، گروہ یا طبقہ کسی مذہبی رہنما کا وارث ہے اور اس وجہ سے وہ دوسرے پر فوقیت رکھتا ہے۔ اس قسم کی برتری کا احساس اسلام سے قبل اکثر گروہوں میں موجود تھا۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کیونکہ وہ آخری نبی ہیں جن کو انسانیت کی ہدایت کے لیے مبعوث فرمایا گیا اور ان کے بعد قیامت تک کے لیے یہ سلسلہ ختم کر دیا گیا اس لیے حضور نے اپنا وارث کسی فرد یا خاندان کو نہیں ٹھہرایا بلکہ خلافت کا تاج پوری امت کو پہنایا ہے۔

وَعَدَ اللّٰہُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنْکُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَیَسْتَخْلِفَنَّھُمْ فِی الْاَرْضِ (النور، ۷)

اللہ نے وعدہ کیا ہے ان لوگوں سے جنھوں نے تم میں سے ایمان قبول کیا اور عمل صالح کیا کہ وہ ان کو زمین میں اپنا خلیفہ بنائے گا۔

یہ تصور مسلم قوم کے اندر ہر قسم کی نسلی وراثتی فضیلتوں کو ختم کر کے شرافت اور نیکی کو معیار بزرگی ٹھہراتا ہے اور یہ ایک ایسی منزل ہے جس کی طرف ہر فرد بڑھنے کے لیے یکسر آزاد ہے اور ہر ایک کو یکساں مواقع میسر ہیں اس راہ میں کسی پر کوئی پابندی نہیں اور دنیا کی کوئی چیز اس کے راستے میں حائل نہیں ہو سکتی۔ حضرت سلمان فارسیؓ سے لوگوں نے آپ کے خاندان کی نسبت جب دریافت کیا تو آپ نے جواب دیا تھا "سلمان ابن اسلام" یہ جواب ایک شخص کا جواب نہیں بلکہ ایک تہذیب کا جواب ہے، جو انھوں نے زندگی کے ایک نہایت ہی اہم مسئلہ کو حل کرنے کے لیے دیا تھا۔ اقبال نے اس واقعہ کو اپنے اس شعر میں نقل کیا ہے ؎

فارغ از باب دام و اعمام باش ہمچو سلمان زادۂ اسلام باش

اسی طرح اس اعتقاد نے کہ حضورؐ کی وارث پوری ملت اسلامیہ ہے، نہ کہ ایک فرد خاندان یا کوئی مخصوص طبقہ اسلامی سوسائٹی کو قیصریت، پاپائیت اور مغربی تصور والی مذہبی ریاست (THEOCRACY) کے فتنوں سے بالکل محفوظ کر دیا ہے۔ یہاں اب کوئی شخص یہ کہہ کر اپنی بات نہیں منوا سکتا کہ چونکہ اس کا تعلق فلاں نسل یا نسب سے ہے جو خدا کو زیادہ عزیز ہے اس لیے اس کے قول کو بلا سند تسلیم کر لیا جائے۔ یہاں اسے اپنے اس نسب کی وجہ سے سماج میں کوئی امتیازی مقام حاصل نہیں ہو سکتا۔ جو برتری کسی انسان کو مل سکتی ہے وہ اس تقویٰ کی وجہ سے ہے جسے اس نے اپنی ذات میں پیدا کیا۔

مگر اس ضمن میں یہ یاد رہے کہ اس کی نیکی کا یہ امتیاز اسے قانون سے بالاتر نہیں بنا سکتا۔ قانون کی نظر میں مسلم سوسائٹی کا ہر فرد، خواہ امیر ہو یا غریب، شریف ہو یا وضیع، آمر ہو یا مامور دوسرے کے برابر ہے۔ کسی کے عابد و زاہد ہونے سے قانون کے اجرا و نفاذ میں سرمو کوئی فرق واقع نہیں ہو سکتا۔ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے جس سختی سے اس اصول کی اہمیت کو واضح فرمایا اس کا اندازہ اس ایک واقعہ سے لگایا جا سکتا ہے۔

"ایک مرتبہ قریش کے ایک معزز گھرانے کی ایک عورت نے چوری کی۔ چوری کی سزا اسلام میں ہاتھ کاٹ دینا ہے۔ لوگوں نے بسبب عورت کے خاندان کی عظمت، اور پھر سزا کی نوعیت پر نگاہ کی تو بعض لوگوں کو یہ چیز گراں گزری۔ بعد انھوں نے قانون کے استعمال میں بھی فرق مراتب کو ملحوظ رکھنا چاہا جس کے وہ جاہلیت میں عادی تھے۔ چنانچہ اسامہؓ بن زیدؓ سے جو آنحضرتؐ کو نہایت محبوب تھے درخواست کی گئی کہ وہ اس عورت کے بارہ میں آپؐ سے سفارش کریں۔ انھوں نے لوگوں کے اصرار سے مجبور ہو کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سفارش کی۔ آپ ان پر نہایت ناخوش ہوئے اور فرمایا کہ تم اللہ کی حدود کے معاملہ میں سفارش کرتے ہو؟ پھر لوگوں کے سامنے ایک خطبہ دیا جس میں یہ فرمایا کہ تم سے پہلے بھی بہت سی قومیں اس وجہ سے ہلاک ہوئیں کہ جب ان میں کوئی معمولی آدمی چوری کرتا تو اس کو سزا دیتے اور اگر کوئی با اثر آدمی چوری کرتا تو اس سے درگزر کر جاتے۔ لیکن میں ایسا نہیں کرنے کا۔"

خطبہ جاری رکھتے ہوئے فرمایا:

والذی نفس محمد بیدہ لو سرقت فاطمة بنت محمد لقطعت یدها

اس ذات کی قسم جس کی مٹھی میں محمدؐ کی جان ہے، اگر فاطمہ بنت محمدؐ نے چوری کی ہوتی تو میں اس کا ہاتھ بھی ضرور کاٹ لیتا۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے ایک سپہ سالار کو ضروری ہدایت دیتے ہوئے اس اصول کی طرف ان الفاظ میں توجہ دلائی۔

لیس بین اللہ وبین احد نسب الا بطاعتہ فالناس شریفھم ووضیعھم فی دین اللہ سواء

اللہ اور کسی شخص کے درمیان کوئی رشتہ نہیں ہے۔ مگر اس کی اطاعت کے واسطے سے۔ اس وجہ سے خدا کے قانون میں شریف اور حقیر سب برابر ہیں۔

اسلام کا یہ جلیل القدر فرزند خلافت کی ذمہ داری سنبھالنے کے بعد خود اپنے اہل وعیال کو یہ تنبیہ فرماتا رہتا تھا۔

لا اعلمن احداً وقع فی شیٔ مما نھیت عنہ الا اضعفت لہ العقوبۃ

جن باتوں کی میں نے ممانعت کر رکھی ہے اگر تم میں سے کوئی ان میں مبتلا پایا گیا تو یاد رکھو اس کو دوگنی سزا دوں گا۔

اس کے علاوہ اس تصور نے حکومت پر کسی خاص فرد یا گروہ کی اجارہ داری کو ختم کر کے اُسے عامۃ المسلمین کا حق قرار دیا ہے۔ اسی وجہ سے اسلامی ریاست کی عاملہ عام مسلمانوں کی رائے سے ہی بنتی ہے، وہی اس کو معزول کرنے کے مختار ہوتے ہیں ہمارے انتظامی معاملات اور تمام وہ مسائل جن کے متعلق خدا کی شریعت میں کوئی صریح حکم موجود نہیں ہوتا، وہ مسلمانوں کے اجماع سے ہی طے کئے جاتے ہیں، اور الٰہی قانون جہاں تعبیر طلب ہوتا ہے وہاں کوئی مخصوص طبقہ یا نسل اس فرض کو سرانجام نہیں دیتا بلکہ عام مسلمانوں میں سے ہر وہ شخص اس کا حق رکھتا ہے جس نے اس کی قابلیت بہم پہنچائی ہو۔ یہاں جس شخص کو خلیفہ منتخب کیا جاتا ہے اس کی اصل حیثیت صرف یہی ہے کہ تمام خلفا اپنی رضامندی سے اپنی خلافت کو انتظامی اغراض کے لیے اس شخص کی ذات میں مرکوز کر دیتے ہیں۔ مگر خلافت کی یہ خلعت اسے سوسائٹی میں کسی امتیازی سلوک کا مستحق نہیں ٹھہراتی۔ قانون کی نگاہ میں اس کی حیثیت عام شہریوں کے برابر ہوتی ہے۔

اس سلسلہ میں ایک اور گذارش یہ ہے کہ ختم نبوت کے عقیدہ ہی نے مسلمانوں کے نظام مملکت کو ایک خاص سانچے میں ڈھالا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد چونکہ انسانوں کو براہ راست وحی الٰہی کی رہنمائی حاصل نہیں ہو سکتی۔ اس لیے اس امر کی شدید ضرورت ہے کہ مسلمان اپنے معاملات باہمی مشورہ سے طے کریں تاکہ غلطی کا امکان کم سے کم ہو جائے۔ حضور سرور دو عالم نے خود اپنی زندگی میں نہ صرف مشوروں کو سنا، بلکہ ان میں سے بعض کو

قبول فرما کر اُن پر عمل بھی کیا۔ اسی سے اسلام میں شورائی نظام کی بنیادیں مستحکم ہوئیں۔

اس سلسلے میں قرآن مجید نے جو اصولی ہدایت دی ہے وہ یہ ہے:

وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ (شوریٰ ۳۸) اور ان کا نظام باہمی مشورہ پر مبنی ہے۔

اس اصولی ہدایت کی وضاحت بھی خود حضور نے اس طرح فرمائی تھی

حدثنی ابو سلمة ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم سئل عن الامر یحدث لیس فی کتاب ولا سنة فقال ینظر فیه العابدون من المومنین۔

مجھ سے ابو سلمہ نے بیان کیا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا کہ اگر کوئی ایسا معاملہ پیش آن پڑے جس کا ذکر نہ تو کہیں قرآن میں ہو اور نہ سنت میں تو ایسی صورت میں کیا کیا جائے؟ آپ نے فرمایا کہ اس معاملہ پر مسلمانوں کے صالح لوگ غور کر کے فیصلہ کریں گے۔

اسی اصول پر سرورِ عالمؐ کے صحابہؓ سختی سے کاربند رہے۔ چنانچہ حضرت ابوبکرؓ جو اسلام میں پہلے خلیفہ ہیں مسلمانوں کے مشورہ عام ہی سے خلیفہ منتخب ہوتے اور خلافت کی باگ ڈور سنبھالنے کے بعد تمام امور کا فیصلہ جن کے بارہ میں کتاب و سنت میں کوئی واضح ہدایت موجود نہ تھی لوگوں کے مشورے ہی سے کیا ان کے اس طرز عمل سے متعلق سنن دارمی کی یہ حدیث ملاحظہ ہو:

حدثنا میمون بن مہران فقال کان ابوبکر اذا ورد علیه الخصم نظر فی کتاب اللہ فان وجد فیه ما یقضی بینهم قضی به وان لم یکن فی الکتاب وعلم من رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم فی ذلک الامر سنة قضی به فان اعیاہ خرج فسأل المسلمین وقال اتانی کذا وکذا فهل علمتم ان رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم قضی فی ذلک بقضاء

ہم سے میمون بن مہران نے حدیث بیان کی کہ حضرت ابوبکر کے پاس فریق معاملہ کوئی مقدمہ لاتے تو وہ پہلے اس پر کتاب اللہ کی روشنی میں غور کرتے۔ اگر اس میں ان کو کوئی ایسی چیز مل جاتی جس سے ان کے مابین وہ فیصلہ ہو سکتا تو اس کے مطابق وہ اس کا فیصلہ کر دیتے۔ اور اگر کتاب اللہ میں انہیں اس کے فیصلے کے لیے کوئی چیز نہ ملتی اور سنت رسول اللہ میں کوئی چیز مل جاتی تو پھر اس کے مطابق فیصلہ کرتے لیکن اگر سنت رسول اللہ میں بھی کوئی چیز نہ پاتے تو مسلمانوں سے دریافت کرتے

فربما اجتمع اليه النفر كلهم يذكر من رسول الله صلى الله عليه وسلم فيه قضاء فيقول ابوبكر الحمد لله الذي جعل فينا من يحفظ على نبينا فان اعياه ان يجد فيه سنة من رسول الله صلى الله عليه وسلم جمع رؤس الناس وخيارهم فاستشارهم فاذا اجتمع رايهم على امر قضى به	کہ میرے سامنے اس طرح کا معاملہ آیا ہے کیا کسی شخص کے علم میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی ایسا فیصلہ ہے جو اس قسم کے معاملہ سے متعلق ہو؟ بسا اوقات ایسا ہوتا کہ آپ کے پاس متعدد ایسے اشخاص جمع ہوجاتے جو اس قسم کے معاملے سے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی فیصلہ بیان کرتے۔ اگر ایسا ہوتا تو حضرت ابوبکرؓ اس بات پر اللہ کا شکر ادا کرتے کہ امت کے اندر ایسے لوگ موجود ہیں جو رسول کا علم محفوظ کئے ہوئے ہیں۔ لیکن اگر اس تلاش کے بعد بھی ان کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی سنت نہ ملتی تو پھر قوم کے لیڈروں اور ان کے اچھے لوگوں کو جمع کرکے ان سے مشورہ کرتے اور جب وہ کسی بات پر جم جاتے تو اس کے مطابق وہ معاملے کا فیصلہ کردیتے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں اس شورائی نظام نے جس حد تک ترقی کی اس کی تفصیل مولانا شبلی نعمانیؒ نے اپنی تصنیف 'الفاروق' میں وضاحت کے ساتھ پیش کی ہے۔

"حضرت عمرؓ نے بغیر کسی مثال اور نمونے کے جمہوری حکومت کی بنیاد ڈالی اور اگرچہ وقت کے اقتضا سے اس کے تمام اصول و فروع مرتب نہ ہوسکے۔ تاہم جو چیزیں حکومت جمہوری کی روح ہیں سب وجود میں آگئیں ان میں سب کا اصل الاصول مجلس شوریٰ کا انعقاد تھا۔ یعنی جب کوئی انتظام پیش آتا تھا تو ہمیشہ ارباب شوریٰ کی مجلس منعقد ہوتی تھی اور کوئی امر بغیر مشورہ اور کثرت رائے کے عمل میں نہیں آسکتا تھا۔[2]

"مجلس شوریٰ کا انعقاد اور اہل الرائے کی مشورت۔ احسان و تبرع کے طور پر نہ تھی بلکہ حضرت عمرؓ نے مختلف موقعوں پر صاف صاف فرما دیا تھا کہ مشورے کے بغیر خلافت سرے سے جائز ہی نہیں۔ ان کے الفاظ یہ ہیں لَاخِلَافَةَ اِلَّاعَنْ مَشْوَرَةٍ۔[3]

[1] یہ سب عبارتیں مولانا امین احسن کے مضمون اسلام میں شوریٰ اور قانون سازی کی صحیح نوعیت سے نقل کی گئی ہیں۔
[2] الفاروق ص [illegible] - [3] الفاروق ج [illegible]

مجلس شوریٰ کے بارے میں یہ حقیقت ذہن نشین رہے کہ اس میں وہی لوگ شریک کئے جاتے تھے جنھیں عوام کا اعتماد حاصل ہو ؛ اور جو دینی و دنیوی معاملات میں گہری بصیرت رکھتے ہوں ۔

پھر مشورہ صرف مجلس شوریٰ کے ارکان سے ہی نہ لایا جاتا بلکہ جب کوئی ضرورت پیش آتی تو عام رعایا سے بھی رائے طلب کی جاتی ۔ مولانا شبلی اس کا تذکرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں :

"مجلس شوریٰ کے ارکان کے علاوہ عام رعایا کو انتظامی امور میں مداخلت حاصل تھی ۔ صوبجات اور اضلاع کے حاکم اکثر رعایا کی مرضی سے مقرر کئے جاتے تھے بلکہ بعض اوقات بالکل انتخاب کا طریقہ عمل میں آتا تھا ۔ کوفہ بصرہ اور شام میں جب عمال خراج مقرر کئے جانے لگتے تو حضرت عمر نے ان تینوں صوبوں میں احکام بھیجے کہ وہاں کے لوگ اپنی اپنی پسند سے ایک ایک شخص انتخاب کر کے بھیجیں جو ان کے نزدیک تمام لوگوں سے زیادہ دیانتدار اور قابل ہو۔"[1]

اس ضمن میں یہ بات بھی قابل غور ہے کہ خداوند تعالیٰ نے اس دنیا میں نبوت کا وارث پوری امت کو قرار دے کر اگر ایک طرف اس کے مقام کو بلند کیا ہے تو دوسری طرف اس کی ذمہ داریوں میں بھی اضافہ کیا ہے ۔ قرآن مجید میں اس حقیقت کا تذکرہ ان الفاظ میں ملتا ہے :

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا (البقرہ ۱۶)	اور اسی طرح تو ہم نے تمہیں ایک امت وسط بنایا ہے تاکہ تم دنیا کے لوگوں پر گواہ ہو اور رسول تم پر گواہ ہو ۔ (البقرہ ۱۶)

خداوند تعالیٰ کا یہ ارشاد جہاں مسلمانوں کو "امت وسط" ہونے کی بشارت دے رہا ہے وہاں وہ اس حقیقت کو بھی ان پر واضح کر رہا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد رسول کے قائم مقام ہونے کی حیثیت سے تم کو عام انسانوں پر گواہ کے طور پر اٹھنا ہوگا اور اپنے قول و فعل سے اس بات کو ثابت کرنا ہوگا کہ رسول نے جو کچھ تمہیں پہنچایا ہے ، وہ تم نے عوام الناس تک پہنچانے میں اور جو کچھ اس مقدس ذات نے تمہیں دکھایا ہے اسے نوع انسانی کو دکھانے میں کوئی کوتاہی نہیں کی ۔ اور جب تک تم اس دنیا میں موجود ہو تمہیں "شاھد علی الناس" کے اس مشن کی تکمیل میں مصروف رہنا ہوگا ۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے خدا ترسی ، راست روی ، عدالت اور حق پرستی کی

---

[1] الفاروق صہ ۳۰۸

جو تعلیم تمہیں دی ہے، اسے اپنے افعال و کردار میں قیامت تک کے لیے محفوظ رکھنا تمہارا فرض ہے اور اسی میں تمہاری زندگی ہے۔ دین کی کامیابی بھی اسی سے وابستہ ہے اور آخرت کی فلاح کا راز بھی اسی میں مضمر ہے۔

گذشتہ صفحات میں جو کچھ عرض کیا گیا ہے اس سے یہ حقیقت واضح ہے کہ یہ عقیدہ ایک مابعد طبیعی تصور کی حیثیت سے دین اسلام میں شامل نہیں بلکہ اسلامی تہذیب و تمدن کی ترتیب و تشکیل میں اسے ایک خاص اہمیت حاصل ہے۔ یہی ایک عقیدہ ہے جس نے مسلمانوں کے سامنے قیامت تک ایک پیکرِ محسوس کی شکل میں واحد معیار حق پیش کیا، انھیں رشد و ہدایت کی معروضی قدریں عطا کیں۔ اُن کے باہم اجزا کو ایک امت بنایا، ان میں خود اعتمادی پیدا کی اور عقل و فکر سے خود کام لینا سکھایا، عالم اخلاق میں زمان و مکان کی ساری حد بندیوں کو ختم کیا اور ملّت اسلامیہ میں ہر قسم کے نسلی، نسبی اور قومی امتیازات کو مٹا کر سوسائٹی میں ایک صحیح قسم کی معاشرتی، معاشی اور سیاسی مساوات کی داغ بیل ڈالی۔

از رسالت درجہان تکوین ما — از رسالت دین ما آئین ما
از رسالت صد ہزار ما یک است — جزو ما از جزو ما لاینفک است
ما ز حکم نسبت او ملتیم — اہل عالم را پیام رحمتیم
دامنش از دست دادن مردن است — چوں گل از باد خزاں افسردن است
از رسالت ہم نوا گشتیم ما — ہم نفس ہم مدعا گشتیم ما
فرد از حق ملت از وے زندہ است — از شعاع مہر او تابندہ است

(رموز بے خودی) (اقبال)

(بقیہ، اسلام اور ہمارا قانونی نظام) کیا گیا تاکہ دختِ رز کے ساتھ ساتھ دختران مصر کو بھی غیروں کے سامنے پیش کیا جائے۔ آخر ہماری حکومتیں شراب و شاہد کو اجنبیوں کی خدمت میں پیش کرنے میں کیوں بخل سے کام لیتیں جب کہ انھوں نے اپنے سارے ملکی ذرائع و وسائل اور اموال و اسباب کو لاکر غیروں کے قدموں میں ڈال دیا تھا؟[1]

[1] قارئین نے اندازہ کر لیا ہوگا کہ مصر کی دردناک داستان پاکستان اور دیگر ممالک اسلامیہ کی داستان سے کس قدر مشابہ ہے۔ (ترجمان)

اِسلام اور ہمارا قانونی نظام

(۲)

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر مسلمان پر فرض ہے | اسلام مسلمان کے لیے واجب قرار دیتا ہے کہ وہ نیکی کا حکم دے اور برائی سے روکے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ۔ (آل عمران: ۱۰۴) كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ (آل عمران: ۱۱۰) وَالْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنٰتُ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ يَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ (التوبہ: ۷۱) اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ (الحج: ۴۱) كَانُوْا لَا يَتَنَاهَوْنَ عَنْ مُّنْكَرٍ فَعَلُوْهُ لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ (المائدہ: ۷۹)

متعدد احادیث سے اس فریضے کی مزید تاکید و تشریح ثابت ہوتی ہے۔ حضرت ابوبکرؓ سے مروی ہے کہ آپ نے ایک خطبے کے دوران میں فرمایا تھا کہ اے لوگو! تم اس آیت کو پڑھتے ہو: يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا عَلَيْكُمْ اَنْفُسَكُمْ لَا يَضُرُّكُمْ مَّنْ ضَلَّ اِذَا اهْتَدَيْتُمْ۔ اور اس کی غلط تاویل کرتے ہو (یعنی اس سے یہ مطلب نکالتے ہو کہ نجات کے لیے ذاتی نیکوکاری کافی ہے اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی ضرورت نہیں ہے) حالانکہ میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سنا ہے کہ "مامن قوم عملوا بالمعاصی وفیھم من یقدر ان ینکر علیھم فلم یفعل الا یوشک ان یعمھم اللہ بعذاب من عندہ" (جس قوم کے اندر بھی معاصی کا ارتکاب کیا جائے اور اس میں ایسے لوگ بھی موجود ہوں جو ان برائیوں پر ٹوک سکیں مگر وہ ایسا نہ کریں، تو جلد اللہ تعالیٰ ان سب کو (یعنی برائی کرنے والوں اور اس پر ملامت نہ کرنے والوں کو) ایک عام عذاب میں مبتلا کر دیتا ہے) اس سلسلے کے چند دیگر ارشادات نبوی درج ذیل ہیں

لتأمرن بالمعروف ولتنهون عن المنكر أو ليسلطن الله عليكم شراركم ثم يدعو خياركم فلا يستجاب لهم.

تم ضرور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا کام کرتے رہو ورنہ اللہ تعالیٰ تمہارے بُروں کو تم پر مسلط کر دے گا۔ پھر تمہارے اچھے دعا کریں گے لیکن قبول نہ ہوگی۔

ما اعمال البر عند الجهاد في سبيل الله الا كنفثة في بحر لجي وما جميع اعمال البر والجهاد في سبيل الله عند الامر بالمعروف والنهي عن المنكر الا كنفثة في بحر لجي.

جہاد کے مقابلے میں نیک کام ایسے ہیں جیسے ایک بحر ذخار کے مقابلے ایک ذرا سا چھینٹا اور تمام اچھے کام بمعہ جہاد فی سبیل اللہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے بالمقابل ایسے ہیں جیسے ٹھاٹھیں مارتے ہوئے سمندر میں ذرا سا چھینٹا۔

افضل شهداء امتي رجل قام الى امام جائر فامره بالمعروف ونهاه عن المنكر فقتله على ذلك فذلك الشهيد منزلته في الجنة بين حمزة وجعفر. بئس القوم قوم لا يأمرون بالقسط وبئس القوم قوم لا يأمرون بالمعروف ولا ينهون عن المنكر

میری امت کا بہترین شہید وہ ہے جو ظالم حکمران کے سامنے کھڑے ہو کر اُسے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرے اور پھر وہ ظالم اسے قتل کر دے۔ یہ شہید ایسا ہے کہ جس کا مقام جنت میں حمزہ اور جعفرؓ کے درمیان ہوگا۔ بہت بری ہے وہ قوم جو عدل کا حکم نہ دے، بہت بری ہے وہ قوم جو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر نہ کرے۔

من رأى منكم منكراً فليغيره بيده فان لم يستطع فبلسانه فان لم يستطع فبقلبه وذلك اضعف الايمان.

جو کوئی تم میں سے بُرائی دیکھے اُسے چاہیے کہ ہاتھ سے اُسے بدلے، اگر ایسا نہ کر سکے تو زبان سے بدلے اگر ایسا بھی نہ کر سکے تو دل سے اُسے بُرا جانے اور اسے بدلنے کی خواہش رکھے اور یہ ایمان کا کمزور ترین درجہ ہے۔

امر بالمعروف یہ ہے کہ لوگوں کو اس امر کی تبلیغ و تلقین کی جائے کہ وہ اپنے اقوال و افعال میں احکام شریعت کی پابندی کریں۔ نہی عن المنکر یہ ہے کہ لوگوں کو اس بات کی ترغیب دلائی جائے کہ وہ ان تمام اعمال کو ترک کر دیں جن کے ترک کرنے کا شریعت نے حکم دیا ہے۔ یہ امر مسلمانوں میں متفق علیہ ہے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا کام مسلمانوں کی مرضی، اختیار اور صوابدید پر نہیں چھوڑ دیا گیا کہ چاہیں تو اسے کریں اور چاہیں تو نہ کریں۔ یہ کام ایک امر مستحسن

شفقت رحمت الٰہی سے کامل امید ہے کہ وہ مصنف اور ان کے مرحوم رفقاء کو یہ مقام عطا فرمائے گا۔ (ترجمان)

و مستحب کے درجے میں نہیں ہے کہ اگر کرلیا جائے تو اچھا ہے اور نہ کیا جائے تو کچھ حرج نہیں۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر مسلمانوں پر قطعی واجب ہے، اسے ادا کیے بغیر چارہ نہیں ہے، اسے ترک کرنا یا اس کی ادائیگی میں کوتاہی دکھانا مطلقاً جائز نہیں ہے۔ یہ پوری امت مسلمہ پر ایک اجتماعی فریضہ ہے اور دنیا سے برائی کو مٹانے اور نیکی کو پروان چڑھانے کے لیے اس فریضے کو انجام دینا ضروری ہے۔ حکومتوں کے لیے بھی ضروری ہے کہ وہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کریں، جماعتوں کے لیے بھی ضروری ہے کہ وہ یہ کام کریں اور افراد کے لیے بھی ضروری ہے کہ وہ یہ کام کریں۔ صرف اسی صورت میں فساد اور منکر کا استیصال کیا جا سکتا ہے اور صلاح و تقویٰ کی فضا پیدا کی جا سکتی ہے۔

موجودہ زمانے کا حال یہ ہے کہ اس میں برائی چہار سو پھیل چکی ہے۔ افراد برائیوں کا ارتکاب کرتے ہیں، نہ وہ خود رکتے ہیں اور نہ کوئی دوسرا انہیں روکتا ہے۔ حاکم اور محکوم مل کر اللہ کی نافرمانی کرتے ہیں اور اللہ کی حرام کردہ چیزوں کو حلال سمجھتے ہیں۔ حکومتیں مسلمانوں کے لیے ایسے قوانین وضع کرتی ہیں جو مسلمانوں کو کفر، شرک اور ارتداد کی طرف دھکیلتے ہیں۔ ان افسوسناک حالات میں ہر مسلمان پر فرض ہے کہ وہ کوشش کا حق ادا کرے۔ ایک مسلم خواہ ملازم ہو یا نہ ہو، خواہ جج ہو یا نہ ہو، اس کے لیے ضروری ہے کہ غیر اسلامی قوانین کو بدلنے کی کوشش کرے۔ ساری دنیا کے مسلمانوں کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ اس مقصد میں ایک دوسرے سے تعاون کریں، اور اس کے لیے اگر ہاتھ نہیں استعمال کر سکتے تو اپنے دل سے، اپنی زبان سے، اپنے قلم سے اس کی تائید کریں۔

تمام مسلمانوں پر واجب ہے کہ وہ "بر" اور "تقویٰ" کے معاملے میں ایک دوسرے سے تعاون کریں اور "اثم اور عدوان" کے معاملے میں تعاون نہ کریں۔ اگر مسلمان اس کام کو اپنے ہاتھ میں لے لیں تو اللہ تعالیٰ ان کی مدد اور نصرت فرمائے گا اور باطل کے "اصنام و طواغیت" کو منہدم کر دے گا۔ مسلمانوں کی جماعت پر اللہ کا ہاتھ ہے۔ بندہ اللہ کے کام میں جب اپنے بھائی کی مدد کرتا ہے تو اللہ بھی اس کی مدد کرتا ہے۔ ایک مسلم کو غیر اسلامی قوانین کے خلاف لڑتے رہنا چاہیے۔ اس فرض کی ادائیگی کے خلاف جہلا خواہ کچھ بھی کہتے یا کرتے رہیں، وہ مسلم کا کچھ نہیں بگاڑ سکیں گے۔ شرط صرف یہ ہے کہ مسلمان کے پاس اپنے فعل کے حق میں دینی حجت اور اس پر کامل یقین موجود ہو۔ اسی حقیقت کو قرآن نے اس طرح واضح فرمایا ہے:

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا عَلَیْكُمْ اَنْفُسَكُمْ لَا یَضُرُّكُمْ — اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو تم اپنی فکر کرو۔ وہ شخص تمہیں

مَنْ ضَلَّ اِذَا اهْتَدَیْتُمْ (المائدۃ ۵: ۱۰۵) کچھ ضرر نہیں پہنچا سکتا جو گمراہ ہو گیا ہے، بشرطیکہ تم ہدایت پر ہو

قانون کا مقصد و منشأ اپنی روح اور حقیقت کے اعتبار سے قانون ایک ایسی ناگزیر ضرورت ہے جس سے انسانی معاشرے کو مفر نہیں ہے۔ اسی قانون کی وساطت سے اجتماعی شیرازہ بندی ہوتی ہے۔ مظالم کی روک تھام ہوتی ہے، حقوق کی حفاظت کی جاتی ہے، عدل کو قائم کیا جاتا ہے اور اقوام عالم میں داخلی و خارجی ربط و نظم پیدا ہوتا ہے۔ بشری ضروریات ہی نے قانون کے ادارے کو جنم دیا ہے، اس کے وجود و ارتقا کو ممکن بنایا ہے اور اس کی اطاعت و احترام کو ایک پسندیدہ فعل کی حیثیت سے انسان کے دل و دماغ میں جاگزیں کیا ہے۔ معاشرے کے متفرق افراد ایک نظام جماعت سے اپنے آپ کو اس غرض سے وابستہ کرتے اور قانون کی بالادستی کو تسلیم کرتے ہیں تاکہ ظلم و جور سے محفوظ رہیں اور امن و سلامتی سے زندگی بسر کر سکیں۔ قانون کی ضرورت اس وجہ سے بھی لاحق ہوتی ہے کہ اگر بہت سے افراد کے خلاف طاقت استعمال نہ کی جائے تو وہ ایسے افعال کر گزرتے ہیں جو بحیثیت مجموعی سوسائٹی کے مفاد کے منافی ہوتے ہیں اور اسی طرح وہ ایسے بہت سے فرائض کی انجام دہی سے باز رہتے ہیں جو ان پر معاشرے کی جانب سے عائد ہوتے ہیں۔ بہرکیف اس طرح کی بے شمار انفرادی و اجتماعی ضروریات اس بات کا تقاضا کرتی ہیں کہ جماعتی زندگی کو ایک قانونی نظام کی بنا پر استوار کیا جائے۔ اس بحث سے یہ حقیقت بھی واضح ہو جاتی ہے کہ قانون انسانی معاشرے سے ماورا کوئی ایسی شے نہیں ہے جسے اجتماعی و انفرادی مصالح کو نظرانداز کر کے فرد یا جماعت پر جبراً مسلط کر دیا جاتا ہے۔ فی الاصل قانون کا مقصد وحید ایصالِ منفعت اور دفعِ ضرر ہے۔

قانون کسی شکل میں بھی، کسی رنگ میں ہو وہ جماعت کی خدمت اور اس کی فلاح و بہبود کا آلۂ کار ہے۔ اگر قانون تعلیم کو جبری اور لازمی قرار دیتا ہے تو اس لیے کہ بے علمی اور جہالت دور ہو، اگر قانون مجرموں کو سزا دیتا ہے تو اس غرض سے کہ امن قائم ہو اور جرائم کا سدِباب ہو اور اگر قانون ظلم کی ہر صورت کو ممنوع قرار دیتا ہے تو محض اس مقصد کی خاطر کہ کسی کی حق تلفی نہ ہو اور ہر شخص اطمینان کی زندگی گزار سکے۔ قانون کے وجود اور اس کے قہر و غلبہ کے لیے واحد وجۂ جواز یہی ہے کہ وہ معاشرے کی خدمت اور سعادت کا موجب ہو۔ جو قانون اپنے اس حقیقی مقصد و مآل کے حصول میں ناکام رہے وہ سراسر باطل اور ناقابل قبول ہے اور کسی طرح کے احترام اور اطاعت کا قطعاً مستحق نہیں ہے بلکہ وہ اس امر کا سزاوار ہے کہ اسے جڑ بنیاد سے اکھاڑ پھینکا جائے۔

اگر ہم ایسے قانون کو دل سے تسلیم کریں گے یا اُس کے سامنے اپنا سر خم کریں گے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ہم پورے معاشرے پر ظلم کر رہے ہیں اور اُس کے حقوق کو پامال کر رہے ہیں۔

ہر قوم کا اپنا اپنا قانون ہے قانون کے بارے میں بنیادی اصول یہ ہے کہ مختلف عقائد و نظریات رکھنے والی اقوام کے قانونی نظام ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہوتے ہیں اور ہر قوم کا قانون اُس کے افکار و احساسات کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ قوم کے ماضی، حال اور مستقبل سے قوانین کا نہایت گہرا تعلق ہوتا ہے اور ہر قانون میں قوم کے اخلاقی، تہذیبی، معاشرتی اور سیاسی تصوّرات کا عکس موجود ہوتا ہے۔ قومی مزاج کا اختلاف لازماً قانون کے اختلاف کی صورت میں جلوہ گر ہوتا ہے۔ جاپان کا قانونی ضابطہ ہندوستان کے قانونی ضابطے سے اتنا ہی مختلف ہے جتنی کہ جاپانی قوم ہندی قوم سے اپنے معتقدات و نظریات میں مختلف ہے۔ روسی قوانین اور انگریزی قوانین کے درمیان اسی نسبت سے امتیاز موجود ہے جس نسبت سے امتیاز ان دونوں قوموں کے عقائد و افکار میں پایا جاتا ہے اس لحاظ سے عام بول چال میں جب ہم کسی خاص مجموعۂ قوانین کو ایک خاص قوم کی طرف منسوب کرتے ہیں تو یہ نسبت محض ظاہری نام کی حد تک نہیں ہوتی بلکہ یہ ایک حقیقی ربط و تعلق کو ظاہر کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر قوم اپنے قوانین کی حفاظت و مدافعت کے لیے کمربستہ اور مستعد رہتی ہے اور اس کی توہین و تذلیل کو اپنی توہین و تذلیل خیال کرتی ہے۔ اسی کا ایک لازمی نتیجہ یہ بھی ہے کہ ایک قوم کے مقننین اگر کسی دوسری قوم سے کوئی قانون مستعار لیتے بھی ہیں تو اسے جوں کا توں اپنے قوانین میں داخل نہیں کر دیتے بلکہ اس میں اس حد تک اصلاح و ترمیم کر لیتے ہیں کہ وہ اپنے قانونی ڈھانچے میں انمل بے جوڑ نہ معلوم ہو۔ ہر قوم اس بات کو اچھی طرح جانتی ہے کہ کسی دوسری قوم کی غلامی اور چاکری قبول کر لینے کی بدترین شکل یہ ہے کہ اُس کے قوانین کو لے کر بلا دنی التغیر اپنے ہاں رائج کر دیا جائے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک قوم نے اپنی قومی انفرادیت کو خیرباد کہہ دیا اور دوسری قوم کی اطاعت کا قلادہ خود اپنی گردن میں ڈال لیا۔

بلادِ اسلامیہ کے اجنبی قوانین لیکن مقامِ افسوس ہے کہ مندرجہ بالا اصولِ قانون کو مصر میں اور دوسرے ممالک اسلامیہ میں بہت بڑی حد تک پامال کر دیا گیا ہے۔ مغربی اقوام کے ضابطہ ہائے قوانین کے ایک بڑے حصّے کو من وعن درآمد کر کے یہاں نافذ کر دیا گیا ہے۔ ان مسلمان ممالک کے اندر تیرہ سو سال تک کم و بیش اسلامی احکام و قوانین کو غلبہ اور

فرمانروائی حاصل رہی ہے، ان ممالک کی عظیم اکثریت اسلام کے نظریۂ حیات پر ایمان رکھتی ہے اور زندگی کے ہر گوشے میں اس کے اوامر و نواہی پر کاربند رہنے کی ہمیشہ کوشش کرتی رہی ہے جن لوگوں نے مغرب کے قوانین کو اخذ کرنا شروع کیا تھا، ان کے لیے ضروری تھا کہ وہ مسلمانوں کے حال اور ماضی کو پیش نگاہ میں رکھتے۔ لیکن ان مقلدین میں فہم و بصیرت کا مادہ بہت قلیل تھا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ مسلمان ممالک میں ایسے غیر مانوس اور بیگانہ قوانین کو بالادستی حاصل ہو گئی جن میں نہ مسلمانوں کے ماضی کی کوئی جھلک تھی، نہ ان میں مسلمانوں کے موجودہ مسائل کا کوئی مداوا تھا اور نہ ہی مستقبل کے لیے اُن میں کوئی روشنی اور رہنمائی تھی۔ بلکہ یہ قوانین مسلمانوں کے عقائد و عزائم کی عین ضد تھے۔ ان قوانین کے شجرۂ نسب کی ایک اجنبی خاک میں تخم ریزی ہوئی اور اجنبی ماحول میں ہی اُسے پروان چڑھایا گیا۔ عجیب بدقسمتی اور سوئے اتفاق ہے کہ اس شجر خبیث کو ایسی جگہ لا کر نصب کر دیا گیا ہے جہاں کے رہنے والے مجبور ہیں کہ اس سے نفرت کریں اور اسے بیخ و بُن سے اکھاڑ پھینکنے کی جدوجہد کریں۔ یہ قوانین ہمیں کفر و الحاد کی طرف دھکیلتے ہیں اور ہمیں اباحیت اور مادر پدر آزادی کی تعلیم دیتے ہیں۔ ان کے اصول و فروع کو ہمارے احوال و کوائف سے دور کی بھی نسبت نہیں ہے۔ ان کی مثال بالکل ایسی ہے جیسے ایک بچے کو والدین سے لے کر زبردستی دوسروں کی سرپرستی میں دے دیا جائے یا ماں باپ سے ان کا اپنا بچہ چھین کر کسی ولد الحرام کو ان کی گود میں ڈال دیا جائے۔

قانون عقائد کا ضامن اور محافظ ہوتا ہے فرد، اور جماعت کی مادی ضروریات کے علاوہ اس کے افکار و عقائد وہ عزیز ترین متاع ہیں جن کی حفاظت بذریعۂ قانون مقصود ہوتی ہے۔ مسلمانوں کے افکار و نظریات کا اصل منبع اور سرچشمہ اسلام ہے۔ ہمارے قوانین بنانے والوں کو اگر اللہ تعالیٰ کچھ بھی سمجھ دیتا تو وہ ہر قانون کے بارے میں سب سے پہلے یہ دیکھتے کہ وہ اسلامی تعلیمات سے مخالفت رکھتا ہے یا نہیں۔ وہ شعائر دینیہ کے موافق ہے یا مخالف۔ لیکن یہ زحمت کسی نے گوارا نہ کی اور اب حال یہ ہے کہ یہ قوانین اسلام کے قوانین کو کھلم کھلا چیلنج دے رہے ہیں، اسلامی عقائد کا مذاق اڑا رہے ہیں، اسلام کے اصولوں کی تحقیر کر رہے ہیں اور اسلام کے حقوق و واجبات کی راہ میں شدت سے حائل اور مزاحم ہو رہے ہیں۔ اس طرح سے ہمارے موجودہ قوانین اصل روحِ قانون کو پامال کر رہے ہیں، جس مقصد کے لیے قانون وضع کیا جاتا ہے اس میں وہ بُری طرح ناکام ہو رہے ہیں اور اپنے

وجود وقیام کے لیے وہ اپنے اندر ادنیٰ ترین وجہِ جواز بھی نہیں پیدا کر سکے ہیں۔ اس میں قانون بیچارے کا کیا قصور ہے؟ قصور ان لوگوں کا ہے جنہوں نے ان قوانین کے نقل کرنے میں کچھ بھی تو عقل سے کام نہیں لیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہمارا امن وسکون غارت ہو گیا ہے، ہمارے گرد وپیش ایک خلفشار اور اضطراب برپا ہے اور عالم اسلام پہ نحوست وشقاوت مسلط ہو رہی ہے۔

قانون کا مقصد خیر کا قیام ہے قانون کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ وہ خیر اور کمال کی طرف ہماری رہنمائی کرے بلکن یورپی قوانین شر اور زوال کی طرف ہماری رہبری کر رہے ہیں اور ہمیں فساد وہلاکت کے کھڈ میں گرانا چاہتے ہیں۔ تاریخ شاہد ہے کہ دنیا بھر کی قوموں کے مقابلے میں مسلمان خیر کے لیے زیادہ حریص تھے، نیکی سے زیادہ قریب تھے اور باہمی تعاون وتراحم پر زیادہ کاربند تھے لیکن جب سے مسلمان ملکوں میں ان بیگانہ قوانین کا چلن ہوا ہے ہم نے رفتہ رفتہ عزت وشرف کا مقام کھو دیا ہے اور ہم اخلاقی فضائل ومکارم سے بالکل عاری ہو گئے ہیں۔ ہمارے اندر خود پسندی، انانیت، مادہ پرستی اور ابن الوقتی عام ہو چکی ہے، اور جائز وناجائز اور حلال وحرام کی تمیز ہمارے درمیان سے اٹھ چکی ہے۔ ایک وقت وہ تھا کہ ہماری اخلاقی رفعت کی دنیا میں مثال دی جاتی تھی اور ایک وقت یہ ہے کہ ہم حیوانات کی طرح اپنی خواہشات کے گرد گھوم رہے ہیں بلکہ درندوں کی مانند شکار کی تلاش میں دوڑتے پھر رہے ہیں۔

قانون ناجائز انتفاع کو روکتا ہے قانون کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ وہ ناروا نفع اندوزی اور جبری استحصال کو روکے لیکن دیارِ اسلامیہ کے قوانین کا عالم یہ ہے کہ وہ گھڑے ہی اس لیے گئے ہیں تاکہ استعماری طاقتوں کے مفادات کی نگہداشت کریں، ان کی لوٹ کھسوٹ کو قانونی شکل دیں، مسلمانوں کو اقتصادی محکومی میں مبتلا رکھیں اور ذلت ومسکنت کی گرفت کو کبھی ان پر سے ڈھیلا نہ ہونے دیں۔ سارے عالمِ اسلام کا یہی حال ہے۔ مثال کے طور پر میں اپنے ملک مصر کو لیتا ہوں۔

۱۹۴۵ء میں جب برطانیہ جنگ سے فارغ ہوا تو مصر کا پچاس کروڑ گنی قرضہ اس کے ذمے تھا، جسے سٹرلنگ قرضہ جات کا نام دیا جاتا ہے۔ کیا ہمارا ملک اتنا غنی تھا کہ وہ اتنا عظیم الشان قرضہ برطانیہ کو دے سکتا؟ کیا انگلستان نے قرض کے لیے درخواست کی تھی اور مصر نے اسے قبول کیا تھا؟ نہیں، ہرگز نہیں! یہ خالص چوری، لوٹ اور ڈکیتی تھی جسے قانونی استم ظریفی نے قرضے کا نام دے دیا۔ اسی طرح مصری قوانین نے جلبِ منفعت کی بے شمار ناجائز صورتوں کو

انگریزوں کے لیے جائز قرار دے رکھا ہے۔ یہ قانون غریب مصریوں کے منہ سے لقمے نکال نکال کر برطانویوں کے پیٹ کی نذر کر دیتا ہے۔ مصری قانون کی رو سے انگریزوں کے لیے یہ بالکل جائز ہے کہ وہ ہمارے سٹرلنگ۔ کے بقایاجات میں سے جس قدر چاہیں اپنے تصرف میں لے آئیں۔ ہمارے ہاں "بنک اہلی" کی حیثیت بالکل ایک انگریزی ادارے کی سی ہے۔ انگلستان کے خزانے کے تمسکات کے بالمقابل اس بنک سے مصری کرنسی کا حصول قانوناً جائز قرار دیا گیا ہے۔ اس طرح سے مصری سرمایہ پر غاصبانہ قبضے کی ایک قانونی شکل فراہم کر دی گئی ہے۔ برطانوی ہنڈیوں کے عوض انگریز ہمارے مال و دولت میں سے جو کچھ چاہتے ہیں لوٹ لے جاتے ہیں کیا اس طرح کا قانون عادلانہ اور منصفانہ قرار دیا جا سکتا ہے جس کا مقصد یہ ہو کہ ایک قوم کے افراد اپنے پیٹ کاٹ کر دوسری قوم کے تنورِ شکم کے لیے ایندھن فراہم کریں؟ ایک قوم کے لوگ قوت لایموت کے لیے بھی ترس رہے ہوں اور انھی کے بل پر دوسری قوم کے لوگ دادِ عیش دے رہے ہوں؟

گزشتہ جنگ کے ختم ہوتے ہی ہم نے اس گرانبار قرضہ کی ادائیگی کا مطالبہ شروع کر دیا تھا۔ اگر یہ قرض اب تک واپس مل چکا ہوتا تو اپنی قومی زندگی کے ہر گوشے میں تعمیرِ جدید کا کام شروع کر کے ہم کامیابی کی متعدد منزلیں طے کر چکے ہوتے لیکن ہمارے مطالبات کے جواب میں انگریزوں نے لیت و لعل اور ٹال مٹول کی روش اختیار کر لی۔ انھوں نے ہمارے لیڈروں سے یہ کہنا شروع کیا کہ "ہم نے جنگ میں مصر کی حمایت و حفاظت کی تھی، اس لیے ان قرضوں میں تخفیف کی جائے"۔ کیا ہم نے انگریزوں سے درخواست کی تھی کہ وہ ہماری حفاظت کریں؟ کیا ہم نے یہ خواہش ظاہر کی تھی کہ ایک لمحے کے لیے بھی ان کی فوجیں یہاں مقیم ہوں؟ کیا ہم نے کسی کے خلاف یا کسی نے ہمارے خلاف اعلانِ جنگ کیا تھا؟ افسوس کہ ہماری آنکھیں اب تک نہیں کھلیں۔ ہم نے اب تک ان انگریز نواز قوانین کے بدلنے کی کوئی کوشش نہیں کی۔ ہماری زندگی کی ساری ضروریات کو انگریز دونوں ہاتھوں سے سمیٹ کر لیے جا رہا ہے، حتیٰ کہ بازار میں سے سبزی ترکاری، پھل اور گوشت بھی پہلے اس کے حضور میں حاضر کیا جاتا ہے اور اس غارت گری کے بعد جو کچھ ہمارے لیے بچ رہتا ہے وہ نہایت قلیل مقدار میں ہوتا ہے اور نہایت گراں قیمت پر ضرورت مندوں کو ملتا ہے۔ صرف اغنیاء ہی اس کے خریدنے کی قوت رکھتے ہیں۔ وہی خریدتے ہیں اور عوام حسرت بھری نگاہوں سے انھیں دیکھتے رہ جاتے ہیں۔ اسی طرح لوہا، لکڑی، سیمنٹ اور دوسرا سامانِ تعمیر برطانوی سپاہیوں کی چھاؤنیوں میں اور ان کے افسروں کے بنگلوں میں

کھپ جاتا ہے۔ ان سب چیزوں کی کوئی قیمت نہیں ادا کی جاتی بلکہ برطانیہ کے خزانے میں ہمارے واجب الوصول قرضوں میں جمع ہوتی رہتی ہے جس کی ادائیگی کی نوبت نہ جانے کب آئے گی۔ اس ادائیگی کا اگر کبھی وعدہ کر دیا جاتا ہے تو اسے بھی بہت بڑا احسان شمار کیا جاتا ہے اور توقع کی جاتی ہے کہ اس احسان کے بوجھ سے ہماری گردنیں جھک جائیں گی۔ کیا اس کا صاف مطلب یہ نہیں ہے کہ ہمارے قوانین ظلم، غصب اور سلب و نہب کا ایک آلہ ہیں جسے ہمارے دشمن استعمال کر رہے ہیں اور ہماری حکومت اور قانون کے محافظین کی نگرانی میں یہ سب کچھ کیا جا رہا ہے؟

مصری قانون استعمار کا خدمت گزار ہے

قوانین مصر یہ سامراجی اور اجنبی مفادات کے پورے پورے خادم اور محافظ ہیں۔ وہ قائم ہی اس بنیاد پر کئے گئے ہیں کہ امپیریلسٹ طاقتوں کی خدمت بجا لائیں اور انہیں ابنائے مصر کا خون چوسنے کے مواقع فراہم کر دیں۔ ان قوانین کی غرض و غایت یہ ہے کہ اہل مصر کو خیر کے رستوں سے ہٹایا اور شر کے رستوں پر بڑھایا جائے، انہیں ضعف و جہالت میں مبتلا رکھا جائے اور انہیں سامراج کا تر نوالہ بنایا جائے۔ ہمارے یہاں ریونیو ٹیکس اور کسٹم سے متعلق جتنے مالیاتی قوانین رائج ہیں وہ مصری مزدور اور کسان کی جیب کو خالی کر کے انگریز سرمایہ دار کی جیب بھرتے ہیں۔ یہ بات بلا مبالغہ اور بلا خوف تردید کہی جا سکتی ہے کہ ان قوانین کا اولین ہدف یہ ہے کہ برطانیہ کی تجارت کو چمکایا جائے اور مصر کو برطانوی مصنوعات کی منڈی بنایا جائے۔ یہاں درآمد سے متعلق اس طرح کے قوانین موجود رہے ہیں، جن کے بل پر انگلستان کے علاوہ ان تمام ممالک کی مصنوعات کا یہاں آنا محال ہو جاتا تھا جن کے ساتھ ارزانی کے لحاظ سے انگلستان مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ ہم میں سے اکثر کو معلوم ہے کہ جاپان کا تیار کردہ مال محض اس وجہ سے مصر میں نہیں آ سکتا تھا کہ اس پر حد سے زیادہ محصول عائد کیا جاتا تھا، ورنہ جاپانی موٹریں، ریڈیو اور دوسری اشیاء انگلستان کے مقابلہ میں پانچ گنا سستی ہوتی تھیں۔

مصر کے بے شمار ذرائع و وسائل استعمار کے بقا کے لیے صرف ہو رہے ہیں۔ ہم سڑکیں تیار کرتے ہیں، ریل کی پٹریاں بچھاتے ہیں اور انگریز انہیں اپنی عسکری اور تجارتی نقل و حرکت میں استعمال کرتے ہیں۔ ہم بندرگاہیں تعمیر کرتے ہیں اور انگریزوں کے جہاز ان میں لنگر انداز رہتے ہیں، ہم تار اور ٹیلیفون کی لائنیں پھیلاتے ہیں اور انگریز ان سے مستفید ہوتے ہیں، انگریز اور ان کے حلیفوں کے لیے کھانے پینے اور دوسری قسم کا سامان آتا ہے، مصر اسے ڈھونے کی خدمت سر انجام دیتا ہے لیکن ایک پیسہ بھی اس سے نہیں کماتا کیونکہ وہ ہر طرح کے ٹیکس اور کسٹم ڈیوٹی سے

مستثنیٰ ہے۔ ہماری گاڑیوں، چھکڑوں اور حمل ونقل کے ذرائع کی قلیل اور حقیر اُجرت اگر از روئے قانون غیر ملکیوں پر عائد ہوتی بھی ہے تو وہ اس کے ادا کرنے میں انتہائی بخل، تنگ ظرفی اور بے اعتنائی سے کام لیتے ہیں، اور نہایت پوچ عذرات کی بنا پر اسے روکے رکھتے ہیں۔ یہ سب کچھ قانون کی ناک کے نیچے ہوتا ہے لیکن قانون خاموش رہتا ہے۔ اجنبی سود خواروں کو قانون کی طرف سے پوری چھوٹ ہے کہ وہ خون آشام جونکوں کی طرح مصر کے غربا کا لہو نچوڑتے رہیں۔ اس طرح مصری غریب سے غریب تر ہوتے چلے جا رہے ہیں اور بیرونی مہاجن امیر سے امیر تر بنتے جا رہے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ مصر ان حرام خوروں اور قمار بازوں کی چراگاہ بن کر رہ گیا ہے اور وہ ہماری اقتصادی رگ حیات پر پوری طرح قابو پا چکے ہیں۔ بڑے بڑے بنک اور کمپنیاں غیروں کی ہیں، تجارت اور صنعت و حرفت میں بیش بہا سرمایہ غیروں کا ہے اور درآمد برآمد غیروں کے ہاتھ میں ہے۔ وہ دن نہایت ناپاک اور منحوس تھا جس دن ہمارے ملک میں سودی لین دین کو قانوناً جائز قرار دے دیا گیا۔ مسلمان کے دین میں سودی کاروبار قطعاً حرام ہے۔ مسلمان نہایت مجبوری کی حالت میں سودی قرض لینے کے گناہ کا تو مرتکب ہو جاتا ہے لیکن اُسے اگر دین کا کچھ بھی پاس ہو تو وہ سودی قرضہ دینے اور اس پر سود لینے کے لیے کبھی آمادہ نہیں ہوتا۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ یہاں سود دینے والے زیادہ تر مصری ہیں اور سود لینے والے غیر مصری۔ اس طرح سے دولت کی یک طرفہ گردش کی وجہ سے تمام مصری سرمایہ غیروں کے ہاتھوں میں جمع ہوتا چلا جا رہا ہے۔

مصر میں شراب اور زنا حلال ہے سرزمین مصر میں شراب کو بھی حلال کر دیا گیا ہے، حالانکہ دین اسلام نے اسے حرام قرار دیا ہے جس دن شراب کو حلال کیا گیا تھا اس دن یہاں سو میں سے ایک آدمی بھی ایسا نہ تھا جو شراب کے مزے سے آشنا ہو۔ عام مسلمانوں کو معلوم بھی نہ تھا کہ یہ کس بلا کا نام ہے۔ اسی طرح مصر میں ہزار میں سے ایک آدمی بھی ایسا نہ تھا جو تحریم خمر کا شاکی ہوتا یا اس کی تحلیل کا مطالبہ کرتا۔ پھر آخر اس ام الخبائث کو حلال کرنے کی کیا ضرورت پیش آئی تھی؟ کس شے نے ہمارے حکام کو اسلام کے خلاف صریح بغاوت پر مجبور کیا؟ یہ محض اغیار کی خوشنودی اور رضا کی طلب کا مذموم جذبہ تھا۔ ہماری حکومتیں یہ چاہتی تھیں کہ اپنے اوپر سے ایک انتہائی سنگین تہمت کو دفع کریں، وہ تہمت یہ تھی کہ مسلمان مذہبی تعصب میں غرق ہیں اور اسلام کے بوسیدہ قوانین کو دانتوں سے پکڑے ہوئے ہیں۔ اسی طرح ہمارے ملک میں زنا کو بھی حلال کر دیا گیا ہے، حالانکہ ہمارے دین نے اسے حرام قرار دیا ہے۔ اس فعل شنیع کو بھی اس لیے جائز

(باقی صفحہ ۷۵ پر)

رسائل و مسائل

(احکام زکوٰۃ)

"ترجمان" محرم ۱۳۷۴ھ میں خان محمد صاحب ربانی کی طرف سے زکوٰۃ کے بارے میں چند سوالات شائع کیئے گئے تھے۔ ربیع الاوّل کے پرچے میں اس سے متعلق مولانا مودودی کی رائے پیش کی گئی تھی۔ اب جناب مولانا ظفر احمد صاحب عثمانی تھانوی نے ان دونوں پرچوں کو ملاحظہ فرما کر اس بارے میں اپنی تحقیق علی الترتیب اپنے دو عنایت ناموں میں مدیر "ترجمان" کے نام ارسال فرمائی ہے۔ ہم بڑی خوشی اور شکریے کے ساتھ ان دونوں گرامی ناموں کو ترجمان میں نقل کر رہے ہیں۔

مکتوب اوّل

بعد الحمد و الصلوٰۃ۔ بعض احباب نے "ترجمان القرآن" بابت محرم ۱۳۷۴ھ کی طرف مجھے توجہ دلائی جس میں ایک مقالہ حضرات علماء کی خدمت میں چند سوالات کے عنوان سے شائع کیا گیا ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ فقہ حنفی میں زکوٰۃ کی ادائیگی کے لیے تملیک کی جو شرط لگائی گئی ہے وہ صرف ایسی صورت میں قابل عمل ہے جب کہ لوگ انفرادی طور پر اپنی زکوٰۃ نکال کر انفرادی طور پر ہی اس کو صرف کر دیں، لیکن اگر اجتماعی طور پر مثلاً اسلامی حکومت کے ذریعہ سے اس کو وصول اور صرف کرنے کا انتظام کیا جائے تو یہ شرط اپنے جزئی احکام کے ساتھ ایک دن بھی نہیں چل سکتی۔ پھر سوال کی توضیح کے لیے چند عملی مشکلات پیش کر کے علماء سے ان کا حل دریافت کیا گیا۔ جواباً عرض ہے کہ تملیک فقیر زکوٰۃ کے لیے شرط ہی نہیں بلکہ رکن ہے بلکہ زکوٰۃ کی حقیقت ہی تملیک فقیر ہے جیسا فقہاء کی عبارات سے آئندہ واضح ہو جائے گا اور حسب زمانے میں زکوٰۃ حکومت اسلامی کے ذریعہ وصول کی جاتی تھی تو اس کی یہ صورت نہ تھی کہ عامل تنہا ہر شخص کے مکان یا چراگاہ پر جاتا اور زکوٰۃ وصول کرتا ہو، بلکہ اس کے ساتھ سپاہیوں کا ایک دستہ ہوتا تھا وہ اس مقام کے تھانہ یا تحصیل میں زکوٰۃ کے مویشی اور اموال جمع کرتے تھے اور اس بستی کے غرباء ایسی جگہ جمع ہو جاتے اور ان پر زکوٰۃ تقسیم کر دی جاتی تھی، جب تک اس مقام پر فقراء موجود ہوتے دوسرے مقام پر زکوٰۃ منتقل نہ ہوتی تھی۔

پھر چونکہ ولایت عامہ کی وجہ سے امام فقراء کا وکیل ہوتا اور عمال امام کے نائب ہوتے تھے، اگر فقراء کی مصلحت سے زکوٰۃ کو منتقل کرنے کی ضرورت ہوتی تو امام اور اس کے عمال کو مصارف نقل بھی مال زکوٰۃ سے وصول کرنے کا حق تھا جیسا خود فقیر مال زکوٰۃ پر قبضہ کرکے اپنے گھر لے جاتا تو مصارف نقل اسی مال سے نکال سکتا تھا۔ غالباً سائل کے ذہن میں سوال کے وقت یہ نکتہ نہیں تھا کہ امام یا مصدق کا مال زکوٰۃ پر قبضہ کرنا فقراء ہی کا قبضہ کرنا ہے کیونکہ وہ بوجہ ولایت عامہ کے فقراء کا وکیل ہے لیکن اس پر کسی ادارہ کے ناظم یا عامل کو قیاس نہیں کیا جاسکتا کیونکہ اس کو ولایت عامہ حاصل نہیں اس لیے وہ فقراء کا وکیل نہیں اور اس کو یہ حق حاصل نہیں کہ مال زکوٰۃ میں سے ناظم یا عامل کا سفرخرچ یا مصارف نقل وصول کرے اگر ایسا کرے گا تو زکوٰۃ دینے والوں کی زکوٰۃ پوری ادا نہ ہوگی۔

قال فی البدائع واما رکن الزکوٰۃ فرکن الزکوٰۃ هو اخراج جزء من النصاب الی الله تعالیٰ وتسلیم ذلك الیه یقطع المالك یده عنه بتملیکه من الفقیر وتسلیمه الیه او الی ید من هو نائب عنه وهو المصدق.... (الی ان قال) وقد امر الله تعالیٰ الملاك بایتاء الزکوٰۃ بقوله عزوجل وآتوا الزکوٰۃ والایتاء هو التملیك ولذا سمی الله تعالیٰ الزکوٰۃ صدقة بقوله عزوجل انما الصدقات للفقراء والتصدق تملیك (الی ان قال) وعلی هذا یخرج صرف الزکوٰۃ الی وجوه البر من بناء المساجد والرباطات والسقایات واصلاح القناطر وتکفین الموتی ودفنهم انه لا یجوز لانه لم یوجد التملیك اصلاً وکذا اذا اشتری بالزکوٰۃ طعاما فاطعم الفقراء

زکوٰۃ کا رکن یہ ہے کہ مال نصاب کا ایک حصہ خدا کے لیے نکالا جائے اور اسی کے حوالے کیا جائے، اس کی صورت یہ ہے کہ فقیر کو زکوٰۃ کا مالک بنا دیا جائے اور زکوٰۃ اس کے یا اس کے کسی نائب (یعنی مصدق) کے سپرد کرکے زکوٰۃ دینے والا اس سے قطعی طور پر دست بردار ہوجائے...... اللہ تعالیٰ نے زکوٰۃ دینے کا مالکوں کو حکم دیا ہے۔ بقولہ عزوجل وآتوا الزکوٰۃ اور ایتاء تملیک ہی ہے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے زکوٰۃ کو صدقہ کا نام بھی دیا ہے۔ بقولہ عزوجل انما الصدقات للفقراء اور تصدق تملیک ہے.... چنانچہ نیکی کے کاموں، مثلاً مساجد، سرائے، سبیل اور پلوں کی تعمیر و مرمت اور میت کی تکفین و تدفین پر زکوٰۃ جائز نہیں کیونکہ ان میں تملیک اصلاً نہیں پائی جاتی۔ اس طرح اگر زکوٰۃ دینے والا زکوٰۃ سے کھانا خرید لے اور صبح شام اپنی مرضی اور صوابدید سے فقیروں کو کھلائے اور کھانا بجنسہ ان کے سپرد نہ کرے، تو

غداءً وعشاءً (لطريق الاباحة) ولم يدفع عين الطعام اليهم لا يجوز لعدم التمليك (الى ان قال) ولو دفع زكوٰة الى الامام او الى عامله يجوز لانه نائب عن الفقير في القبض فكان قبضه كقبض الفقراء صـ ۳۹ ج ۲۔

عدم تملیک کی بنا پر ایسا کرنا جائز نہ ہوگا۔۔۔۔۔ اگر زکوٰۃ حاکم یا اس کے عامل کے سپرد کردی جائے تو جائز ہے کیونکہ عامل زکوٰۃ وصول کرنے میں فقیر کا نائب اور نمائندہ ہے۔ اس کا زکوٰۃ لینا فقیر کے زکوٰۃ لینے کی مانند ہے۔

بدائع الصنائع ج ۲، صـ ۳۹

زکوٰۃ میں تملیک کا ضروری ہونا متفق علیہ ہے کسی امام کا اس میں اختلاف بیان نہیں کیا گیا بلکہ امام شافعیؒ کی طرف تو یہ قول منسوب کیا گیا ہے کہ ان کے نزدیک اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلْفُقَرَآءِ میں لام ملک کے لیے ہے۔

قال واما النص فقوله تعالیٰ اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلْفُقَرَآءِ وقوله عز وجل وفِيْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ والاضافة بحرف اللام تقتضى الاختصاص بجهة الملك اذا كان المضاف اليه من اهل الملك ..... واما الحقيقة فان الزكوٰة تمليك المال من الفقير والمنتفع بها هو الفقير فكانت حق الفقير صـ ۵ ج ۲ ثانی ودليل عدم نقل الزكوٰة حديث معاذ فان هم اطاعوا لك فى ذالك فاخبرهم ان عليهم صدقة فى اموالهم تؤخذ من اغنياءهم وترد على فقرآءهم (متفق عليه) وروى ابو عبيد فى الاموال كما فى كنز العمال عن عمرو بن سعد ان معاذ بن جبل لم يزل بالجند اذ بعثه رسول الله صلى الله عليه وسلم وابوبكرؓ ثم قدم على عمر فرده على ما كان

اس بارے میں نص یہ ہے۔ انما الصدقات للفقرآء ..... وفی اموالهم حق معلوم للسائل والمحروم للفقراء اور للسائل میں فقراء اور سائل کی طرف حرف لام کی اضافت اور تعلق اس بات کا مقتضی ہے کہ یہاں اختصاص باعتبار ملک مراد لیا جائے بشرطیکہ فقیر اور سائل اہل ملک میں سے ہوں ... حقیقت میں زکوٰۃ یہ ہے کہ مال پر فقیر کی تملیک ہو جائے۔ فقیر ہی اس سے فائدہ اٹھانے والا ہے اور اسی کا یہ حق ہے۔ بدائع ج ۲ صـ ۵

اور زکوٰۃ کے ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل نہ کیے جانے کی دلیل وہ متفق علیہ حدیث ہے جس میں حضرت معاذؓ سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر لوگ تمہاری اطاعت قبول کرلیں تو انہیں آگاہ کر کہ ان کے مالوں پر زکوٰۃ ہے جو ان کے اغنیاء سے لی جائے گی اور ان کے فقراء پر لوٹا دی جائے گی اور کتاب الاموال لابی عبید اور کنز العمال میں روایت ہے

علیه فبعث معاذ بثلث صدقة الناس فانکر
علیه عمر فقال لم ابعثك جابیاً ولا آخذ جزیة
ولکن بعثتك تأخذ من اغنیاء الناس فترده
فی فقرائهم قال معاذ ما بعثت الیك بشیء
وانا اجد احداً یأخذه منی. فلما کان العام
الثانی بعث الیه شطر الصدقة فتراجعا مثل
ذلك فلما کان العام الثالث بعث الیه
بها کلها فراجعه عمر بمثل ما راجعه قبل فقال
معاذ ما وجدت احداً یأخذ منی شیئاً[1] اھ ج ثالث
وفی البدائع ص ج ۲ واما زکوٰة المال فحیث المال
فی الروایات کلها ویکره اخراجها الی غیر اهل
ذلك الموضع الا روایة عن ابی حنیفة انه
لا بأس ان یخرجها الی قرابة من اهل الحاجة ویبعثها الیهم[2]

کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکرؓ نے حضرت
معاذ بن جبل کو یمن بھیجا اور وہ وہیں رہے۔ حضرت عمرؓ کے
زمانے میں وہ آئے مگر انہیں اپنے منصب پر واپس بھیج دیا گیا
بعد میں حضرت معاذ نے لوگوں کی ایک تہائی زکوٰۃ بھجوائی۔
حضرت عمرؓ نے اس پر ناپسندیدگی کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا
کہ میں نے تمہیں ٹیکس اور جزیہ لینے کے لیے نہیں بھیجا تھا۔
میں نے تجھے اس لیے بھیجا تھا کہ تو اغنیاء سے زکوٰۃ لے کر
فقراء میں اسے واپس کر دے۔ حضرت معاذ نے کہا کہ مجھے
اس کا کوئی لینے والا نہیں ملا اس لیے اسے آپ کے پاس بھجوا دیا ہے
دوسرے سال آدھی زکوٰۃ بھیجی اور یہی سوال و جواب ہوا،
تیسرے سال انہوں نے پوری زکوٰۃ بھیجی پھر وہی گفتگو ہوئی اور
حضرت معاذ نے پھر یہی کہا کہ مجھے زکوٰۃ لینے والا نہیں مل سکا۔
اور مال کی زکوٰۃ وہیں نکالی جائے جہاں مال ہے۔ تمام روایات میں

---

[1] قلت والظاهر من قوله بعث معاذ بثلث الصدقة وبشطرها وبکلها انه لم یأخذ منها مؤنة النقل واجرتها بل کان یبعثها مع برید الحکومة من غیر ان ینقص من مال الزکوٰة شیئ ۱۲ ظ

[2] قلت هذا فی زکوٰة الاموال الباطنة التی لا یطالبها الامام واما الاموال الظاهرة فحکمها ما قاله عمرؓ الا تنقل الی غیر ذلك الموضع الا اذا لم یکن هناك من یأخذها والله اعلم ۱۲ ظ

دونوں مذکورہ بالا حواشی مولانا عثمانی کی طرف سے ایزاد کئے گئے ہیں۔ ان کے ترجمے بالترتیب درج ذیل ہیں:- (ترجمان)

[1] اس قول سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت معاذؓ نے صدقہ (تہائی، آدھا یا سارا) نقل و حرکت کی اجرت وضع کیے بغیر اور تنخواہ لیے بغیر بھیج دیا، بلکہ حکومت کی ڈاک کے ہمراہ بھیج دیا ہوگا اور زکوٰۃ میں کچھ کمی نہ ہوئی ہوگی۔

[2] یہ اجازت اموال باطنہ کے بارے میں ہے جن کا حاکم مطالبہ نہیں کرتا، لیکن اموال ظاہرہ کے بارے میں حضرت عمرؓ کے قول پر عمل ہوگا۔ یعنی انہیں ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل نہیں کیا جائے گا الا یہ کہ اصل جگہ مستحق موجود نہ ہو۔

یہی ہے ۔ دوسری جگہ کے لوگوں کی طرف زکوٰۃ کا نکال کر
لے جانا مکروہ ہے۔ سوائے امام ابوحنیفہؒ کی ایک روایت کے
جس کے بموجب دوسری جگہ حاجت مند عزیزوں کو زکوٰۃ پہنچانے
میں مضائقہ نہیں ہے ۔

میرے خیال میں سوال کا جواب اور اشکالات کا حل ہوچکا ہے اب تکمیل کے طور پر چند ضروری مسائل بیان کئے جاتے ہیں تاکہ اگر کسی وقت حکومت پاکستان باقاعدہ بیت المال قائم کرے اور زکوٰۃ کے وصول و تقسیم کا انتظام کرنا چاہے تو ان مسائل کی رعایت کی جائے :

مقدمہ اولیٰ بیت المال میں چار قسم کے اموال الگ الگ رکھے جائیں گے ۔

الف مویشیوں کی زکوٰۃ عشری زمینوں کا عشر، مسلمان تاجروں سے جو کچھ عاشر وصول کرے جب کہ وہ تجارتی مال لے کر اس کی حدود سے گزریں اور یہ تجارتی مال کی زکوٰۃ ہوگی جو سال میں ایک دفعہ چالیسواں حصہ کے حساب سے وصول کی جائے گی اس کے مصرف فقراء و مساکین اور زکوٰۃ کے عاملین اور نو مسلم فقراء ، اور قرض دار جن کا موجودہ سرمایہ ادائے قرض کے لیے کافی نہیں ، اور وہ مجاہد جن کے پاس میدان جہاد میں کافی سامان نہیں، اور مسافر جن کے پاس یہاں سے سفر گھر تک پہنچنے کا خرچ نہ رہا ہو ، اور وہ غلام ہیں جن کے مالکوں نے خاص مقدار میں رقم مقرر کردی ہو کہ اس کو ادا کر دینے پر آزاد ہو جائیں گے جن کو شریعت میں مکاتب کہا جاتا ہے ۔ یہ قسم آج کل یہاں موجود نہیں ممکن ہے جہاد کی نوبت آنے پر ان کا وجود ہو جائے ۔

ب : مال غنیمت کا خمس اور کانوں اور دفینوں کا خمس ۔ کانوں کا خمس اس وقت لیا جائے گا جب کہ حاکم اسلام کسی کو ان کے کھودنے اور نکالنے کی اجازت دے دے ۔ اگر حکومت خود اپنے اہتمام سے کانیں کھودنے اور نکالنے کا بندوبست کرے تو جو کچھ نکلے گا سب حکومت اسلام کا ہوگا البتہ اگر کسی کو اتفاقی طور پر کسی پہاڑ سے کچھ سونا وغیرہ مل گیا تو اس سے بھی خمس لیا جائے گا اور بیت المال میں جمع ہوگا جیسا کسی کو اسی طرح دفینہ مل جائے اور اس کی تفصیل فقہاء کے کلام سے معلوم کی جائے ۔ اس کا مصرف یتامیٰ اور مساکین اور مسافرین ہیں اور جو بچے وہ حکومت کی ضروریات اور اسلحہ وغیرہ میں صرف کیا جائے گا ۔

ج : خراجی زمینوں کا لگان ، اہل ذمہ کا انکم ٹیکس (جس کو جزیہ کہا جاتا ہے) یا کسی مقام کے باشندوں سے کسی خاص مقدار کی

صلح کی گئی ہو تو صلح کی رقوم اور جو کچھ عاشر تجار اہل ذمہ اور مستامنین دار الحرب سے وصول کریں جب کہ وہ اس کی حدود سے تجارتی مال لے کر گذریں اس قسم کا مصرف مصالح مسلمین ہیں جیسے حاکموں، قاضیوں، مفتیوں اور سپاہیوں، فوجیوں کی تنخواہیں، راستوں کی حفاظت، مسجدوں، سرایوں، مسافر خانوں کی عمارت، چھوٹے بڑے پلوں کی مرمت یا تعمیر، سرحدوں کا استحکام اور ایسی نہروں کا انتظام جو کسی کی ملکیت نہیں بلکہ حکومت ہی کی ملکیت ہیں۔

د : لاوارث مردوں کا ترکہ یا ایسے لوگوں کا ترکہ جو اپنے پیچھے صرف بیوی چھوڑ گئے ہیں یا عورت صرف شوہر چھوڑ گئی ہے ان کا حصہ دے کر باقی بیت المال میں داخل کیا جائے گا۔ اسی طرح گری پڑی چیزوں کی کافی تشہیر کے بعد بھی مالکوں کا پتہ نہ لگا ہو تو وہ بھی بیت المال میں داخل کی جائیں گی اس قسم کا مصرف بیمار غریبوں کی دوا علاج معالجہ اور غریب مردوں کا کفن دفن جب کہ وہ کچھ چھوڑ کر نہ مرے ہوں، ایسے بچوں کی پرورش جو کسی جگہ پڑے ہوئے پائے جائیں، ایسے نادار لوگوں کی امداد جو کمانے اور محنت کرنے سے عاجز ہو گئے ہوں اور ان کا کوئی عزیز قریب بھی ایسا نہیں جس کے ذمہ شرعاً ان کا نفقہ واجب ہو۔ امام پر لازم ہے ان جملہ اقسام کے رقوم کو ان کے مستحقوں تک پہنچائے ورنہ عند اللہ ماخوذ ہوگا غالباً اس تفصیل سے معلوم ہو گیا ہوگا کہ باقاعدہ بیت المال قائم ہونے کی صورت میں وہ مشکلیں پیش نہیں آسکتیں جو ترجمان القرآن میں بیان کی گئی ہیں۔ کیونکہ سب کاموں کے لیے صرف زکوٰۃ اور صدقہ فطر ہی نہیں بلکہ دوسرے اموال بھی ہیں جن میں تملیک فقیر ضروری نہیں بلکہ مناسب صورت سے ان کو تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ یہاں اس نکتہ پر بھی تنبیہ کر دینا ضروری ہے کہ قسم اول و دوم کے سوا بقیہ اقسام کے اموال مسلمانوں اور ذمیوں دونوں پر حسب ضرورت تقسیم ہو سکتے ہیں۔ چونکہ زکوٰۃ صرف مسلمانوں سے لی جاتی ہے وہ مسلمانوں ہی پر صرف ہوگی اور جہاد بھی صرف مسلمانوں پر فرض ہے۔ اس کی غنیمت کا خمس بھی مسلمانوں پر صرف ہوگا بقیہ اقسام کی تقسیم مسلم و غیر مسلم دونوں پر ہو سکتی ہے۔

مقدمہ ثانیہ حکومت کو اموال باطنہ کی زکوٰۃ کے مطالبہ کا حق نہیں (الا بضرورۃ شدیدہ) بلکہ وہ صرف اموال ظاہرہ کی زکوٰۃ وصول کرنے کی حقدار ہے جیسے مویشیوں کی زکوٰۃ جو سال کے زیادہ حصہ میں گھر پر نہیں بلکہ جنگل میں چرتے ہوں اور ان تاجروں کے تجارتی مال کی زکوٰۃ جو ایک شہر سے دوسرے شہر میں مال لے جاتے ہوں اور باہر سے مال منگاتے ہوں نیز عشری و خراجی زمینوں کا عشر و خراج بھی اموال ظاہرہ سے ہیں۔ اور جو تاجر اپنے شہر ہی میں تجارت

کرتا ہے نہ باہر سے مال منگاتا ہے نہ بھیجتا ہے اس کا تجارتی مال اموال باطنہ میں داخل ہے۔ اسی طرح جو نقد اور زیور کسی کے گھر میں ہے وہ بھی اموال باطنہ سے ہے البتہ جو روپیہ بنک میں یا لمیٹڈ کمپنیوں میں ہے اس کو اموال ظاہرہ میں داخل کیا جاسکتا ہے۔

مقدمہ ثالثہ: حکومت کو اموال ظاہرہ کی زکوٰۃ وصول کرنے کا حق اسی وقت ہے جب کہ وہ ڈاکوؤں، چوروں سے ان اموال کی حفاظت کا انتظام کرتی ہو۔ اگر بدنظمی اور تعطل حدود کی وجہ سے لوگوں کے اموال محفوظ نہ ہوں تو حکومت کو مطالبۂ زکوٰۃ کا حق نہیں ہے۔ اسی طرح اگر امام اور اس کے عمال نماز کے پابند نہ ہوں تب بھی بعض علماء کے نزدیک حکومت کو زکوٰۃ وصول کرنے کا حق نہیں۔

مقدمہ رابعہ: حکومت کو صدقہ فطر اور چرم قربانی اور دیگر صدقات کے مطالبہ کا حق نہیں (الا بضرورۃ شدیدۃ)

مقدمہ خامسہ: اگر حکومت زکوٰۃ و عشر کو اس کے مصارف شرعیہ میں خرچ نہ کرتی ہو تو مالداروں کے ذمہ سے عشر اور زکوٰۃ ادا ہوگی یا نہیں؟ اس میں علماء کا اختلاف ہے۔ بعض کہتے ہیں ادا ہو جائے گی اور بیجا و بے جا صرف کرنے کا وبال حکام پر ہوگا۔ بعض کہتے ہیں کہ خراج تو ادا ہو جائے گا مگر زکوٰۃ و عشر ادا نہ ہوگا، مالداروں کو دوبارہ بطور خود ان کا ادا کرنا واجب ہوگا۔

مقدمہ سادسہ: جن اموال کی زکوٰۃ کے مطالبہ کا حکومت کو حق حاصل ہے اگر کوئی ان کی زکوٰۃ بھی خود ہی ادا کر دے تو فقہاء کا اتفاق ہے کہ زکوٰۃ ادا ہو جائے گی اور امام شافعی کے نزدیک حکومت کو اس سے دوبارہ مطالبہ کا حق نہیں مگر حنفیہ کے نزدیک حکومت کو مطالبہ کا حق ہوگا۔ اموال ظاہرہ میں وہ صاحب مال کی اس بات کو رد کر سکتی ہے کہ اس نے خود زکوٰۃ ادا کردی ہے۔ ہاں اگر وہ یہ کہے کہ میں نے دوسرے مصدق کو زکوٰۃ دے دی ہے یا کوئی تاجر مال لے کر عاشر کے سامنے سے گزرے اور یہ دعویٰ کرے کہ اس سے دوسرے عاشر نے زکوٰۃ وصول کر لی ہے تو مصدق یا عاشر کی رسید دکھلانے پر اس کی تصدیق کی جاوے گی کیونکہ اس صورت میں اس نے حکومت کے حق کو باطل نہیں کیا ہے۔

مقدمہ سابعہ: مطالبہ زکوٰۃ و عشر کا حق اسی حکومت مسلمہ کو ہے جو آئین اسلام کے مطابق اسلامی حکومت ہو۔ ہر حکومت کو یہ حق حاصل نہیں جو کہ برائے نام ہی اسلامی حکومت ہو اور واقع میں اسلامی حکومت نہ ہو۔

(مولانا محترم نے ان مقدمات سبعہ کے بیان کے بعد ان میں سے ہر ایک کی تائید میں کتب فقہیہ کی مفصل عبارات نقل فرمائی ہیں۔ ان عبارتوں کا یہاں دینا بہت موجب طوالت ہوگا۔ خصوصاً جب کہ اُن کے ترجمے بھی کئے جائیں۔ اس لیے ہم مولانا مدظلہ سے معذرت کے ساتھ پہلی چھ عبارتیں حذف کر رہے ہیں۔ البتہ ہم ان چھ کے حوالے کتب وصفحات کی تصریح کے ساتھ بالترتیب تحریر کئے دیتے ہیں، تاکہ ذی علم اصحاب اگر مراجعت کرنا چاہیں تو کر سکیں۔ حوالے یہ ہیں:- بدائع الصنائع ج ۲ ص ۶۹، " ص ۳۰، " ص ۳۶ التلخیص الجبیر ج ۱ ص ۱۷۸ رد المحتار ج ۲ ص ۱۲۷۔ البتہ مقدمۂ سابعہ کا ترجمہ اور اس کی مزید توضیح چونکہ مولانا موصوف نے تحریر فرمائی ہے اس لیے اس مقدمے کی پوری دلیل کو یہاں نقل کیا جا رہا ہے۔ محذوف حوالہ جات ماہنامہ "الصدیق" ملتان، شمارہ جمادی الاولیٰ میں بھی مطالعہ کئے جا سکتے ہیں)

(دلیل المقدمۃ السابعۃ، مافی شرح العقائد النسفیۃ ص ۱۱۰)

المسلمون لابد لهم من امام يقوم بتنفيذ الاحكام واقامة الحدود وسد الثغور وتجهيز جيوشهم واخذ صدقاتهم وقهر المتغلبة والمتلصصة وقطاع الطريق واقامة الجمع والاعياد وقطع المنازعات الواقعة بين العباد وقبول الشهادات القائمة على الحقوق وتزويج الصغار والصغائر الذين لا اولياء لهم وقسمة الغنائم ونحو ذلك من الامور التي لا يتولاها آحاد الامة الى ان قال بعد ذكر ما اورده المورودون على توقف الانتظام على وجود الامام بما نصه. قلنا نعم يحصل بعض النظام في امر الدنيا من غير شوكة له الرياسة العامة) ولكن يختل امر الدين وهو الامر المقصود الاهم والعمدة العظمى

مسلمانوں کے لیے ایسا امام ہونا ضروری ہے جو احکام شرعیہ کی تنفیذ اور حدود شرعیہ کے اجراء اور سرحد اسلام کی حفاظت کا انتظام کرے مسلمانوں کے لیے لشکر تیار کرے ان کی زکوٰۃ وصدقات وصول کرے غلبہ کرنے والوں اور جاسوسوں چوروں اور ڈاکوؤں کو مقہور ومغلوب کرے، جمعہ اور عیدین کی نمازیں قائم کرے اور لوگوں میں جو تنازعات اور جھگڑے پیدا ہوں ان کا شریعت کے موافق فیصلہ کرے اور لوگوں کے حقوق پر جو شہادتیں قائم ہوں ان کو سُنے اور قبول کرے اور نابالغ لڑکے لڑکیاں جن کا کوئی ولی نہیں ہے ان کی شادی بیاہ کا انتظام کرے مال غنیمت کو باقاعدہ تقسیم کرے اس کے علاوہ اور بہت سے کام ہیں جو انفرادی طریقہ سے انجام نہیں پا سکتے۔ اس کے بعد ان اعتراضوں کا جواب دیتے ہوئے جو نصب امام کی ضرورت پر بعض لوگوں نے وارد کئے ہیں لکھا ہے، ہاں ایسے شخص کے ذریعے سے جو نصب شرکت ہو اور اسے ریاست عامہ حاصل ہو۔ دنیا کے بعض امور کا تو

انتظام ہو سکتا ہے مگر دین کا نظام مختل ہو جائے گا اور سب سے بڑا مقصد اسلامی سلطنت قائم کرنے سے یہی ہے۔

یہاں سے یہ حقیقت واضح ہو گئی کہ اسلام کا بڑا مقصد سلطنت قائم کرنے سے امور دین کا انتظام، احکام شرعیہ کا نفاذ، نماز اور زکوٰۃ و صدقات کا نظم اور شریعت کے موافق .... مسلمانوں کے معاملات کا فیصلہ کرنا جہاد اور سامان جہاد کا بندوبست کرنا ہے اگر کسی سلطنت سے یہ مقصد حاصل نہیں ہوتا تو وہ اسلامی سلطنت نہ ہوگی اگرچہ مسلمانوں کی سلطنت ہو اور زکوٰۃ و صدقات وصول کرنے کا حق اسی سلطنت کو ہے جو اس مقصد کو پورا کرے جس کا یہاں ذکر ہو رہا ہے ورنہ اس کو یہ حق حاصل نہ ہوگا پس جو لوگ اسلامی سلطنت میں سیاست اور مذہب کو الگ کرنا چاہتے ہیں وہ اسلامی سلطنت قائم کرنا نہیں چاہتے بلکہ یورپین طرز کی حکومت قائم کرنا چاہتے ہیں۔ حالانکہ دنیا جانتی ہے کہ ہندوستان کو تقسیم کر کے پاکستان اسی لیے حاصل کیا گیا ہے تاکہ یہاں اسلامی سلطنت قائم کی جائے جو مسلمانوں کی زندگی کو اسلامی سانچے میں ڈھالنے کا انتظام کرے اور اقلیت کو وہ حقوق عطا کرے جو اسلامی سلطنت میں دئیے جاتے ہیں جس سے زیادہ عدل و انصاف کے ساتھ تو کوئی حکومت بھی اقلیتوں کو ان کے حقوق نہیں دے سکتی۔ جو لوگ حدود شرعیہ کو وحشیانہ سزائیں کہتے ہیں دراصل وہ ان اعمال کو وحشیانہ نہیں سمجھتے جن کی یہ سزائیں شریعت نے مقرر کی ہیں۔ اگر وہ ان اعمال کو وحشیانہ سمجھتے تو ہرگز ان سزاؤں کو وحشیانہ نہ کہتے کیونکہ تجربہ شاہد ہے کہ ان سزاؤں کے بغیر ان وحشیانہ افعال کا قلع قمع نہیں ہو سکتا۔ یورپ کی سلطنتیں ان وحشیانہ جرائم کا استیصال ہی کرنا نہیں چاہتیں اس لیے وہ اسلامی سزاؤں کو وحشیانہ بتلاتی ہیں۔ اگر وہ ان کا استیصال کرنا چاہتیں تو ان کو ماننا پڑتا کہ اسلام نے جو سزائیں مقرر کی ہیں وہی ان امراض کا اصلی علاج ہے۔ واللہ اعلم۔

مکتوب ثانی

مکرمی السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔ ربیع الاول کا ترجمان القرآن دو دن بعد ملا اس لیے جواب میں دیر ہوئی۔ میں نے مولانا مودودی کی تحریر دیکھی انہوں نے والعاملین علیہا کے عموم میں ہر ادارہ کے عاملین کو داخل کرنے کی کوشش کی ہے۔ مگر یہ صحیح نہیں کیونکہ آیت میں اور بھی عمومات ہیں جن کو بدلیل السنۃ عموم پر نہیں رکھا گیا۔ مثلاً الصدقات کو صدقات مفروضہ پر محمول کیا گیا ہے کیونکہ صدقات نافلہ فقراء و مساکین کے ساتھ مخصوص نہیں۔ غنی کو بھی دے سکتے ہیں۔ اسی طرح الفقراء والمساکین۔ والغارمین مسلمانوں کے ساتھ مخصوص ہیں۔ کفار کو زکوٰۃ

نہیں دے سکتے۔ اسی طرح والعاملین علیھا سے وہی لوگ مراد ہیں جن کو حکومت اسلامیہ نے تحصیل وصول صدقات کے لیے مقرر کیا ہو۔

قال فی البدائع واما العاملون علیھا فھم الذین نصبھم الامام بجبایۃ الصدقات (الی ان قال) ان ما یستحقہ العامل انما یستحقہ بطریق العمالۃ لا بطریق الزکوۃ بدلیل انہ یعطی وان کان غنیا بالاجماع وبدلیل انہ (ای رب المال) لو حمل زکوۃ بنفسہ الی الامام لا یستحق العامل منھا شیئاً ۔۔۔ انہ انما یستحق بعملہ لکن علی سبیل الکفایۃ لہ ولاعوانہ لا علی سبیل الاجرۃ لان الاجرۃ مجھولۃ الخ ج ۲ ص۴۴

عاملین علیھا وہ لوگ ہیں جنہیں امام حکومت نے صدقات وصول کرنے پر مقرر کیا ہو۔۔۔۔ عامل کا رکن ہونے کی حیثیت سے زکوۃ کا مستحق ہوتا ہے، ورنہ وہ براہ راست زکوۃ کا مستحق نہیں ہوسکتا۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ اس پر اجماع ہے کہ وہ غنی ہونے کے باوجود زکوۃ لے سکتا ہے۔ دوسری دلیل یہ ہے کہ اگر زکوۃ دینے والا خود زکوۃ امام تک لے جاتا تو عامل اس میں سے کسی شے کا مستحق نہ ہوتا۔ اس سے ظاہر ہے کہ عامل اپنے اور اپنے رفقاء کے گزر اوقات کے لیے زکوۃ میں سے لیتا ہے، اجرت کے طور پر نہیں لیتا کیونکہ اجرت تو معلوم و متعین ہی نہیں ہے۔

عام طور سے کتب فقہ میں عاملین سے مراد وہی لوگ ہیں جن کو امام یا سلطان نے صدقات وصول کرنے کے لیے مقرر کیا ہو ان ہی کا قبضہ قائم مقام قبضہ فقراء کے ہوسکتا ہے کیونکہ امام کو ولایت عامہ حاصل ہے اور عاملین اس کے نائب ہیں عام ادارے کو ولایت عامہ حاصل نہیں، اس لیے ان کو فقراء مجہولین کا قائم مقام نہیں کہہ سکتے صرف زکوۃ دینے والوں کا نائب کہہ سکتے ہیں کیونکہ وہ تو معلوم ہیں۔ پس ان کے قبضہ کو قبضہ فقراء نہیں کہا جاسکتا اور ان کے ہاتھ میں زکوۃ کی رقم پہنچنے سے زکوۃ دینے والوں کی زکوۃ ادا نہ ہوگی جب تک فقراء کے قبضہ میں نہ پہنچ جائے۔ اب اگر یہ ادارے یا ان کے عاملین زکوۃ میں سے سفر خرچ وغیرہ نکالیں گے۔ زکوۃ پوری ادا نہ ہوگی ادھوری ہوگی۔ پس جو ادارے زکوۃ کی تحصیل و وصول کے لیے کھڑے ہوں ان کو ولایت عامہ حاصل کرنا چاہیئے جس کی صورت یہی ہوسکتی ہے کہ حکومت کی طرف سے ان کو یہ حق دیا جائے یا پھر عامۃ المسلمین باتفاق ان کو یہ حق دے دیں کیونکہ عامۃ المسلمین بھی حکومت کے قائم مقام ہوجاتے ہیں مگر عامۃ المسلمین کا کسی ادارہ پر اتفاق بہت دشوار ہے۔

رسائل و مسائل حصہ اوّل کے ایک مضمون سے متعلق

ایک ضروری استدراک

(ہمیں مولانا مودودی کی جانب سے جیل کی سنسر شدہ مندرجہ ذیل تحریر وصول ہوئی ہے۔ آپ کے حسب ہدایت اسے "ترجمان" میں شائع کیا جا رہا ہے تاکہ جن اصحاب کے پاس یہ کتاب ہو، وہ عبارتیں تبدیل کر لیں۔ انشاء اللہ طبع سوم میں اصل کتاب کے اندر بھی یہ اصلاحات کر دی جائیں گی)

ایک دوست نے مجھے رسائل و مسائل حصہ اوّل کے مضمون "تحقیق حدیث دجال" کی طرف توجہ دلائی ہے اور یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ اس کے بعض الفاظ اور فقروں سے جنابِ رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخی کا پہلو نکلتا ہے۔

معاذ اللہ، کیا کوئی مسلمان اُس بارگاہ میں گستاخی کا کبھی خیال بھی کر سکتا ہے؟ اور اگر کرے تو ایک لمحہ کے لیے بھی دائرۂ ایمان میں رہ سکتا ہے؟ میرے کسی دینی بھائی کو یہ سوءِ ظن تو مجھ سے نہ کرنا چاہیے کہ میں کبھی اس کفر سے بھی ملوث ہو سکتا ہوں۔ البتہ یہ ممکن ہے کہ کسی مسئلے کے بیان میں ایک طرزِ تعبیر میرے نزدیک حدودِ شرع و ادب کے اندر ہو اور دوسرا اس میں کوئی تجاوز محسوس کرے۔ میں نے اس مضمون میں جو کچھ لکھا تھا پورے احساسِ ذمہ داری کے ساتھ یہی سمجھتے ہوئے لکھا تھا کہ یہ حدِ شرع و ادب کے اندر ہے اور اب بھی، اپنے دوست کے توجہ دلانے کے بعد، کافی غور کرنے پر بھی میں اس میں کوئی تجاوز محسوس نہیں کر سکا ہوں۔ تاہم یہ معلوم ہو جانے کے بعد کہ کوئی شخص اس میں تجاوز محسوس کر سکتا ہے میں ان عبارتوں کو بدل دینا زیادہ مناسب سمجھتا ہوں تاکہ کسی غلط فہمی کی گنجائش باقی نہ رہے۔

صفحہ ۵۵۔ سطر ۸ تا ۱۰ کی عبارت اس طرح بدل دی جائے:

"ان امور کے متعلق جو مختلف باتیں حضور سے احادیث میں منقول ہیں ان کا اختلاف مضمون خود بھی یہ ظاہر کرتا ہے، اور حضور کے طرزِ کلام سے بھی یہی مترشح ہوتا ہے کہ وہ آپ نے بربنائے وحی نہیں بلکہ بربنائے ظن و قیاس ارشاد فرمائی ہیں۔"

صفحہ ۵۶۔ سطر ۵ تا ۱۱ کی عبارت یوں لکھی جائے:

ان مختلف روایات پر جو شخص بھی مجموعی نظر ڈالے گا وہ اگر علم حدیث اور اصول دین سے کوئی مس رکھتا ہو تو اسے یہ سمجھنے میں کوئی زحمت پیش نہ آئے گی کہ اس معاملے میں حضور کے ارشادات دو اجزاء پر مشتمل ہیں۔ پہلا جزء یہ کہ دجال آئے گا، ان اوصاف کا حامل ہوگا، اور یہ یہ فتنے برپا کرے گا۔ یہ بالکل یقینی خبریں ہیں جو آپ نے اللہ تعالیٰ کی طرف سے دی ہیں۔ ان میں کوئی روایت دوسری روایت سے مختلف نہیں ہے۔ دوسرا جزء یہ کہ دجال کب اور کہاں ظاہر ہوگا اور وہ کون شخص ہے۔ اس میں نہ صرف یہ کہ روایات مختلف ہیں، بلکہ اکثر روایات میں شک (باقی صفحہ ۳۶۳)

آج کے بچے کل کے رہنما ہیں

اگر کسی ملک کے مستقبل کا اندازہ کرنا ہو تو اسکے بچوں کو دیکھا جاتا ہے کہ انکی اٹھان کس نہج پر ہو رہی ہے بچوں کے ذہن پر بچپن میں جو نقش بٹھا دیئے جاتے ہیں آئندہ زندگی میں وہی انکی سیرت و کردار کی بنیاد بنتے ہیں۔ اگر آپ پاکستان کو ایک مثالی اسلامی مملکت دیکھنا چاہتے ہیں تو اپنے بچوں کے دل و دماغ کو اسلام کے رنگ میں رنگیئے۔

مرکزی مکتبہ جماعت اسلامی پاکستان

اس مبارک کام میں آپکی امداد و رہنمائی اور بچوں کی اسلامی و اخلاقی تربیت کے لئے نہایت سادہ دلنشین اور موثر پیرایہ میں۔ لکھی ہوئی حسب ذیل چیزیں پیش کرتا ہے۔

بچوں کے لئے اصلاحی و اخلاقی کہانیاں

آسان کہانیاں	۰ ۵ ۰
اخلاقی کہانیاں پہلا حصہ	۰ ۵ ۰
اخلاقی کہانیاں دوسرا حصہ	۰ ۵ ۰
اخلاقی کہانیاں تیسرا حصہ	۰ ۷ ۰
اخلاقی کہانیاں چوتھا حصہ	۰ ۷ ۰
مجاہد کی ڈائری	۰ ۵ ۰
کون ہے راجا	۰ ۵ ۰
سچ ہے بھئی سچ ہے	۰ ۵ ۰
ہاضمے کا چورن	۵ ۰
سورج کا پیام	۰ ۵ ۰
طوطوں کی رٹ	۰ ۵ ۰
رحمت کا فرشتہ	۰ ۵ ۰
دس سیر لکڑیاں	۰ ۵ ۰
بھوک	۰ ۵ ۰
سچی کامیابی	۰ ۵ ۰
بکی حویلی	۰ ۵ ۰
حسناتی نظمیں پہلا حصہ	۰ ۵ ۰
حسناتی نظمیں دوسرا حصہ	۰ ۵ ۰
مرغ کا سالن	۰ ۵ ۰

قرآنی قصے بچوں کی زبان میں

غار والے	۰ ۵ ۰
گاؤں والے	۰ ۵ ۰
سنیچر والے	۰ ۵ ۰
اللہ میاں کی اونٹنی	۰ ۵ ۰
جنت سے زمین پر	۰ ۵ ۰
بیٹے کو نصیحت	۰ ۵ ۰

اللہ کے پیارے نبیوں کے مختصر حالات

سادہ اور دلنشین زبان میں

نبیوں کے حالات حصہ اول (حضرت آدم سے حضرت ہود تک)	۰ ۵ ۰
نبیوں کے حالات حصہ دوم (حضرت صالح سے حضرت لوط تک)	۰ ۸ ۰
نبیوں کے حالات حصہ سوم (حضرت یوسف علیہ السلام)	۰ ۸ ۰
نبیوں کے حالات حصہ چہارم (حضرت موسیٰ)	۱ ۸ ۰
پیارے رسول (حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم)	۰ ۸ ۰

ملنے کا پتہ

مرکزی مکتبہ جماعت اسلامی پاکستان - اچھرہ - لاہور

مجموعہ تفاسیر فراہی

تالیف: مولانا حمید الدین فراہی رحمۃ اللہ علیہ

ترجمہ: مولانا امین احسن اصلاحی

مولانا حمید الدین فراہی اس دور آخر میں تفسیر کے امام گذرے ہیں۔ انہوں نے قرآن پر فکر و تدبر کی نئی راہیں کھولیں اور اس کی وہ مشکلیں حل کیں جو اب تک تفسیر کی کتابوں میں حل نہیں ہوسکی تھیں۔ مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی اصل تفسیر عربی میں ہے۔ اس کے جو اجزاء شائع ہو چکے تھے مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد خاص

مولانا امین احسن اصلاحی

نے ان کا شستہ اور شگفتہ اردو میں ترجمہ کر دیا ہے۔ اور شروع میں مصنف کے مختصر حالات زندگی بھی دے دئے ہیں اور مولانا حمید الدین فراہی کے مقدمہ تفسیر کا ترجمہ بھی شامل کر دیا ہے جو اصول تفسیر پر مولانا کے قلم سے ایک نہایت جامع رسالہ ہے۔ اس مجموعہ میں مقدمہ تفسیر کے علاوہ مندرجہ ذیل سورتوں کی تفسیروں کے ترجمے شامل ہیں:۔

تفسیر آیۃ بسم اللہ ' تفسیر سورۂ فاتحہ ' سورۂ ذاریات' سورۂ قیامہ ' سورۂ تحریم' سورۂ عبس' سورۂ و الشمس' سورۂ و التین' سورۂ و العصر' سورۂ فیل' سورۂ کوثر' سورۂ کافرون' سورۂ لہب' سورۂ اخلاص۔

مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے انہیں سے ہر تفسیر میں قرآن مجید کی ایسی اہم مشکلیں حل کی ہیں جو قرآن کے دوسرے مشکل مقامات کے حل کے لئے کلید کا کام دیتی ہیں اور یہ بات پورے اطمینان سے کہی جا سکتی ہے کہ اگر ایک شخص مولانا کے مقدمہ تفسیر قرآن کی روشنی میں ان تمام اجزاء کا بغور مطالعہ کرے تو وہ مولانا فراہی کے اسلوب فکر سے اچھی طرح آشنا ہو جائیگا اور قرآن پر محققانہ تدبر کے لئے اپنی راہیں خود کھول لیگا۔

تفسیری حقائق و معارف کا یہ مجموعہ ۵۲۷ صفحات ۲۰×۲۶/۸ سائز پر مشتمل ہے اور اس کے متعلق بلا تکلف یہ دعوی کیا جا سکتا ہے کہ اسکا ہر صفحہ تفسیری حقائق کا بیش بہا گنجینہ ہے۔ کتابت و طباعت نہایت نفیس۔ جلد عمدہ کپڑے کی .... قیمت: چودہ روپے

تبصرہ

تحقیقاتی عدالت کی رپورٹ

نعیم صدیقی (مدیر چراغ راہ) * سعید ملک (مدیر روزنامہ تسنیم)

کا مرتب کردہ

بے لاگ جامع اور مدلل

تبصرہ

شائع ہو چکا ہے۔ سفید کاغذ اور ۲۰۸ صفحات کے باوجود صرف ایک روپیہ چار آنے میں ہم سے طلب فرمائیں

مرکزی مکتبہ جماعت اسلامی پاکستان اچھرہ۔ لاہور

سرورق جدید اردو ٹائپ پریس، لاہور میں چھپا